

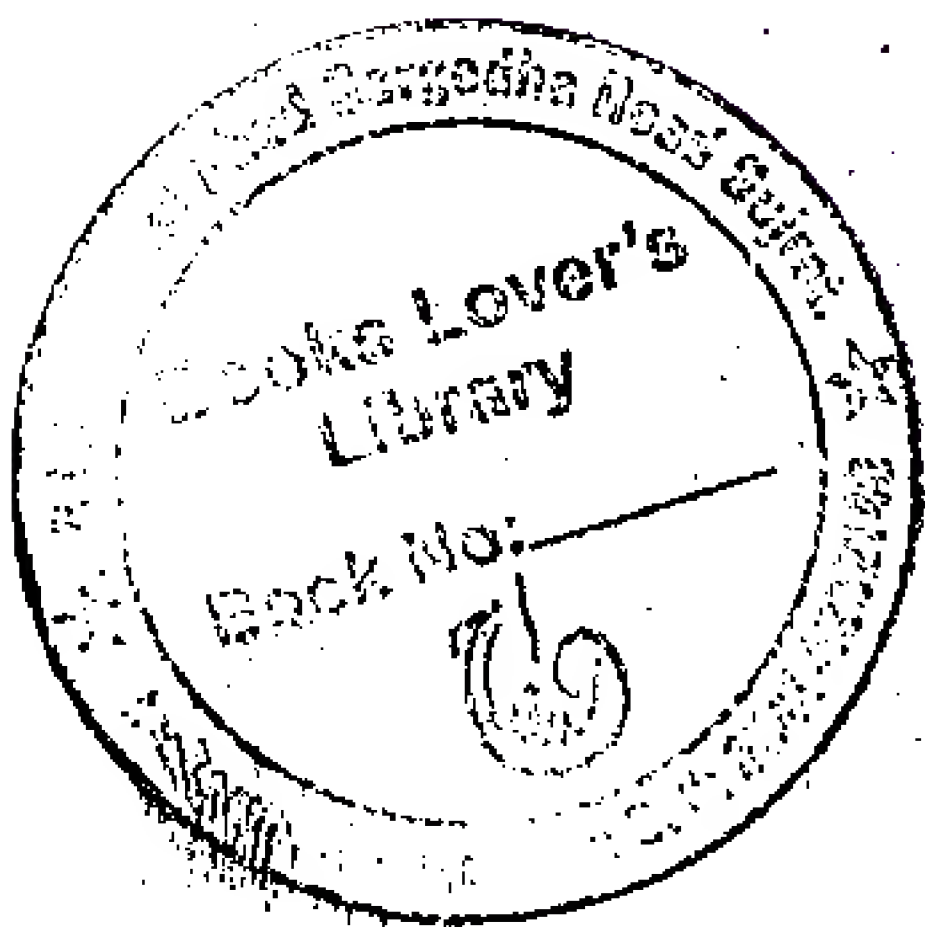
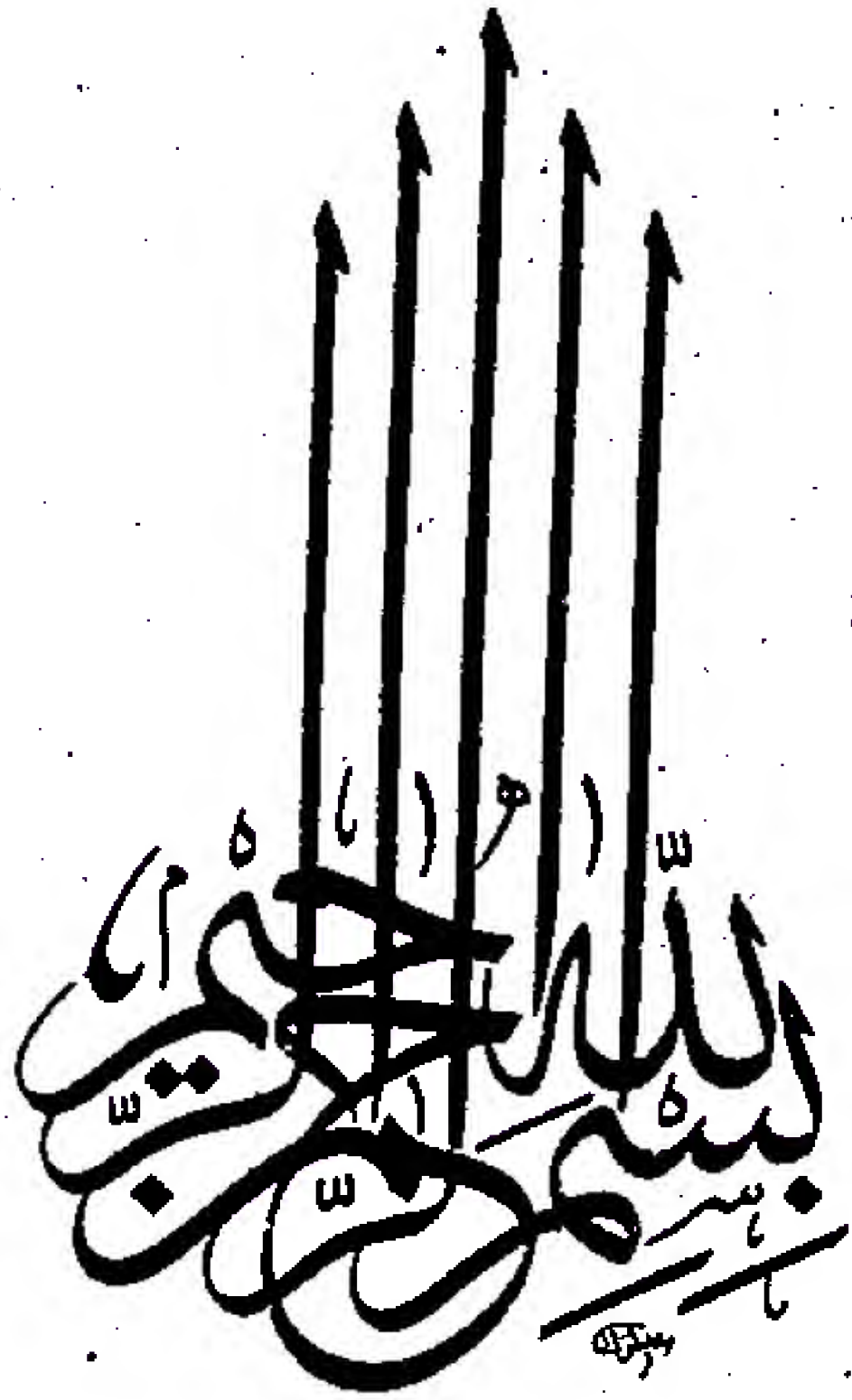
www.iqbalkalmati.blogspot.com

# مرزا جان ادا



مرزا اہادی رسوا





امراؤ جان ادا

ملنے کے لئے

7122943 سعد علی کیشنر، فرسٹ فلور، میاں مارکیٹ لاہور

کشمیر بک ڈپو، تلہ گنگ روڈ، چکوال

7224228 مکتبہ رحمانیہ، آکرا سنٹر، اردو بازار لاہور

کوالٹی ڈیپارٹمنٹ، سنو کالج روڈ، پورے والا

7223506 اسلامی کتب خانہ، فضل الہی مارکیٹ لاہور

مکتبہ رشیدیہ، نیو جنرل، چکوال

ضیاء القرآن پبلشرز، اردو بازار، کراچی

وکیلیم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی

62310 نیو وہاڑی کتاب گھر، جناح روڈ، وہاڑی

یونیورسٹی بک ایجنسی، خیبر بازار، پشاور

رحمن بک ہاؤس، اردو بازار، کراچی

بک سنٹر علامہ اقبال، چوک، سیالکوٹ

الکریم نیوز ایجنسی، گول چوک، اوکاڑہ

منیر برادرز، مین بازار، جہلم

شائلہ بک ایجنسی، محلہ چوہدری پارک، ٹوبہ ٹیک سنگھ

احمد بک کارپوریشن، اقبال روڈ، راولپنڈی

662650 ہلال کانی ہاؤس، لیاقت روڈ، میاں چنوں

بنگلش بک ڈپو، اردو بازار، سیالکوٹ

مکتبہ العلم، ۱-۱- اردو بازار لاہور

چوہدری بک ڈپو، مین بازار، دینہ

میاں ندیم، مین بازار، جہلم

دارالادب، تلمبہ روڈ، میاں چنوں

اسلامک بک سنٹر، اردو بازار، کراچی

اشرف بک ایجنسی، کمیشی چوک، راولپنڈی

ضیاء القرآن پبلشرز، گنج بخش روڈ، لاہور

شمع بک ایجنسی، فیصل آباد

فرید پبلشرز، نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی

ہاشمی برادرز، کتب و رسائل گوردت سنگھ روڈ، کوئٹہ

کتب گھر، علامہ اقبال روڈ، راولپنڈی

رضالا بھیریری، شاہ کوٹ

نیو الیاس کتب محل، کچہری بازار، جڑانوالہ

الاخوان القادری، مسندی کارنارندرون بوہڑ گیٹ ملتان

اوریس کتب محل، مین بازار، منڈی سمہیال

نیو نفیس بک ڈپو، مین بازار، میانوالی

عمر بک سنٹر، جی ٹی روڈ، سرائے عالمگیر 653057

اسلامی کتب خانہ، حافظ آباد

خان بک ڈپو، حافظ آباد

نظای کتب خانہ، پاکپتن شریف

جہانگیر بک ڈپو، اردو بازار، کراچی

خالد کتب محل، ادوگئی، سیالکوٹ روڈ

شکیل بک ڈپو، سمندری

لاٹانی لائبریری، ربوہ

زمان لائبریری، ربوہ

سلیمی بک ڈپو، احمد پور شرقیہ

الیاس بک ڈپو، جلال پور جٹاں

الرحمت شیئرنری، ڈسکہ

چغتائی بک ڈپو، دھڑیال آزاد کشمیر

کاروان بک سنٹر، بہاولپور

جائندھر بک ڈپو، ڈسکہ

اتفاق بک ڈپو، بھلوال

بختار سنز، قصہ خوانی بازار، پشاور

2278843-5 بک ٹاؤن F-10 مرکز اسلام آباد

2204241 میسٹر بکس، سپر مارکیٹ اسلام آباد

مکتبہ فیض، اردو بازار، لالہ موسیٰ 515162

ڈیشان بکس، ستارہ مارکیٹ G-7 اسلام آباد

# امراؤ جان ادا

میرزا محمد ہادی رسوا

خزینہ علم و ادب

الکرنیم مارکیٹ اردو بازار لاہور



حیدرہ زیب اور  
خلو بصورت کتب کا  
واحد مرکز

ترتیب و اہتمام  
نذیر محمد طاہر نذیر



جملہ حقوق محفوظ ہیں

۲۰۰۳ء  
عبید اللہ  
محمد نذیر طاہر نذیر  
الاشراق کمپوزنگ سنٹر، لاہور  
حافظ جمیل پرنٹنگ پریس، لاہور  
/- ۵0 روپے

اشاعت  
سرورق  
اہتمام  
کمپوزنگ  
مطبع  
قیمت

## فہرست

۷	تمہید
۳۱	حصہ اول
۱۱۵	حصہ دوم
۱۷۳	حصہ سوم
۲۱۳	اختتامیہ



## تمہید

ہم کو بھی کیا کیا مزے کی داستانیں یاد تھیں  
لیکن اب تمہید ذکر درد و ماتم ہو گئیں

ناظرین! شان نزول اس قصے کی یہ ہے کہ دس بارہ برس کا ذکر ہے میرے ایک دوست منشی احمد حسن صاحب اطراف دہلی کے رہنے والے بہ طریق سیر و سیاحت لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ انہوں نے چوک میں سید حسین کے پھانک کے پاس ایک کمرہ کرائے پر لیا تھا۔ یہاں اکثر احباب سر شام آ بیٹھتے تھے۔ بہت ہی لطف کی صحبت ہوتی تھی۔ منشی صاحب کا مذاق شعر فہمی اعلیٰ درجے کا تھا۔ خود بھی کبھی کبھی کچھ کہہ لیتے تھے اور اچھا کہتے تھے لیکن زیادہ تر ان کو سننے کا شوق تھا اس لیے اکثر شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ اسی کمرے کے برابر ایک اور کمرہ تھا۔ اس میں ایک طوائف رہتی تھی۔ بود و باش کا طریقہ اور رنڈیوں سے بالکل علیحدہ تھا۔ نہ کبھی کسی نے کمرے پر سر راہ بیٹھے دیکھا نہ وہاں کسی کی آمد و رفت تھی۔ دروازوں میں دن رات پردے پڑے رہتے تھے۔ چوک کی طرف نکاس کا دروازہ بالکل مقفل رہتا تھا۔ گلی کی جانب ایک دروازہ تھا اسی سے نوکر چا کر آتے جاتے تھے۔ اگر کبھی کبھی رات کو گانے کی آواز نہ آیا کرتی تو یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ اس کمرے میں کوئی رہتا بھی ہے یا نہیں۔ جس کمرے میں ہم لوگوں کی نشست تھی اس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی لگی تھی مگر اس میں کپڑا پڑا ہوا تھا۔ ایک دن حسب معمول احباب کا جلسہ تھا۔ کوئی غزل پڑھ رہا تھا احباب داد دے رہے تھے۔ اتنے میں میں نے ایک شعر پڑھا۔ اس کھڑکی کی طرف سے واہ واہ کی آواز آئی۔ میں چپ ہو گیا اور احباب بھی اسی طرف متوجہ ہو گئے۔ منشی احمد حسن نے پکار کر کہا۔ ”غائبانہ تعریف ٹھیک نہیں اگر شوق شعر و سخن ہے تو جلسے میں تشریف لائیے۔“ اس کا کوئی جواب نہ ملا۔ میں پھر غزل پڑھنے لگا بات رفت گزشت ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک مہری آئی۔ اس نے پہلے سب کو سلام کیا پھر یہ کہا ”مرزا رسوا کون صاحب ہیں؟“ احباب نے مجھے بتا دیا۔ مہری نے کہا ”بیوی نے ذرا آپ کو بلایا ہے۔“ میں نے کہا ”کون بیوی؟“ مہری نے کہا ”بیوی نے کہہ دیا ہے کہ نام نہ بتانا آگے جو آپ کا حکم ہو۔“ مجھے مہری کے ساتھ جانے میں تامل

ہوا۔ احباب مجھ سے مذاق کرنے لگے ”ہاں صاحب! جاتے کیوں نہیں، کبھی کی صاحب سلامت ہے جب تو اس طرح بلا بھیجا۔“ میں دل میں غور کر رہا تھا کون صاحب ایسی بے تکلف ہیں۔ ادھر مہری نے کہا ”حضور! بیوی آپ کو اچھی طرح جانتی ہیں، جب تو بلا بھیجا۔“ آخر جانا ہی پڑا۔ جا کے جو دیکھا، معلوم ہوا ”آہ ہا! امر او جان صاحبہ تشریف رکھتی ہیں۔“

امر او جان: (دیکھتے ہی) اللہ! مرزا صاحب! آپ تو ہمیں بھول ہی گئے۔

میں: یہ معلوم کسے تھا کہ آپ کس کوہ قاف میں رہتی ہیں؟

امر او جان: یوں تو میں اکثر آپ کی آواز سنا کرتی تھی مگر کبھی بلانے کی

جرات نہ ہوئی آج آپ کی غزل نے بے چین کر دیا۔ بے

ساختہ منہ سے واہ وانکل گیا۔ ادھر کسی صاحب نے کہا۔ ”یہاں

آئے۔“ میں اپنی جگہ پر آپ ہی شرمندہ ہوئی۔ جی میں آیا

چپ رہوں، مگر پھر دل نہ مانا۔ آخر اگلی خصوصیتوں کے لحاظ سے

آپ کو تکلیف دی۔ معاف کیجیے گا۔ ہاں وہ شعر ذرا پھر پڑھ

دیکھیے۔“

میں: معاف تو کچھ بھی نہیں ہوگا اور نہ میں شعر سناؤں گا۔ اگر آپ کو

شوق ہے تو وہ ہیں تشریف لے چلیے۔

امر او جان: مجھے چلنے میں کوئی عذر نہیں، بس یہ خیال ہے کہ صاحب خانہ یا اور

کسی صاحب کو میرا جانا ناگوار نہ ہو۔

میں: آپ کے حواس درست ہیں! بھلا ایسی جگہ میں آپ کو چلنے کے

لیے کیوں کہتا؟ بے تکلف صحبت ہے، آپ کے جانے سے اور

لطف ہوگا۔

امر او جان: یہ تو سچ ہے، مگر کہیں زیادہ بے تکلفی نہ ہو؟

میں: جی نہیں، وہاں میرے سوا کوئی آپ سے بے تکلف نہیں ہو سکتا۔

امر او جان: اچھا تو کل میں آؤں گی۔

میں: ابھی کیوں نہیں چلتیں؟

امر او جان: اے ہے ابھی؟ دیکھیے تو کس حیثیت سے بیٹھی ہوں!



میں: وہاں کوئی مجرا تو ہے نہیں، بے تکلف صحبت ہے، چلی چلیے۔  
 مراد جان: ادنیٰ مرزا! آپ کی تو باتیں لا جواب ہوتی ہیں، اچھا چلیے میں آتی ہوں۔

میں اٹھ کے چلا آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مراد جان صاحبہ ذرا کنگھی و کنگھی کر کے کپڑے بدل کے آئیں۔

میں نے احباب سے چند الفاظ میں ان کے مذاق شعر و سخن اور کمال موسیقی وغیرہ کی تعریف کر دی تھی، لوگ مشتاق ہو گئے تھے۔ جب وہ شریف لائیں تو یہ ٹھہری کہ سب صاحب اپنا اپنا کلام پڑھیں۔ خلاصہ یہ کہ بڑے لطف کا جلسہ ہوا۔ اس دن سے مراد جان اکثر شام کو چلی آتی تھیں۔ گھنٹہ دو گھنٹہ نشست رہتی تھی۔ کبھی شعر و شاعری کا جلسہ ہوا، کبھی انہوں نے کچھ گایا، احباب محفوظ ہوئے۔ ایسے ہی ایک جلسے کی کیفیت ہم یہاں لکھے دیتے ہیں۔ ان مشاعروں میں نہ کوئی طرح مقرر کی جاتی تھی اور نہ بہت سے لوگوں سے وعدے لیے جاتے تھے۔ صرف بے تکلف احباب ہو جاتے تھے اور اپنی اپنی تازہ تصنیف غزلیں پڑھتے تھے۔  
 مشاعرہ

کس کو سنا کیل حال دل زار اے ادا  
 آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی  
 مرزا رسوا: کیا کہنا بی مراد جان صاحبہ! یہ مقطع تو آپ نے حسب حال کہا ہے۔ اور شعر کیوں نہ پڑھے؟

مراد جان: تسلیم مرزا صاحب! آپ کے سر کی قسم بس وہ مطلع یاد تھا اور یہ مقطع۔ خدا جانے کس زمانے کی غزل ہے۔ زبانی کہاں تک یاد رہے، بیاض گلوڑی گم ہو گئی۔

نشی صاحب: اور وہ مطلع کیا تھا؟ ہم نے نہیں سنا۔

رسوا: آپ تو اہتمام میں مصروف ہیں، سنے کون؟

اس میں شک نہیں کہ نشی صاحب نے آج کے جلسے کے لیے بڑے سلیقے سے انتظام کیا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ مہتابی پردو گھڑی دن رہے سے چھڑکاؤ ہوا تھا، تاکہ شام تک زمین سرد ہو

جائے۔ اسی پردری بچھا کے اجلی چاندنی کافر ش کر دیا گیا تھا۔ کوری کوری صراحیوں پانی بھر کے کیوڑا ڈال کے منڈیر پر چنوا دی گئی تھیں۔ ان پر بالو کے آپ خورے ڈھکے ہوئے تھے۔ برف کا انتظام علیحدہ کیا گیا تھا۔ کاغذی ہانڈیوں میں سفید پانوں کے سات سات گوریاں سرخ صافی میں لپیٹ کر کیوڑے میں بسا کر رکھ دی گئی تھیں۔ ڈھکنوں پر تھوڑا تھوڑا کھانے کا خوشبودار تمباکو رکھ دیا تھا۔ ڈیڑھ خے حقوں کے نیچوں میں پانی چھڑک چھڑک کر ہار لپیٹ دیئے تھے۔ چاندنی رات تھی اس لیے روشنی کا انتظام زیادہ نہیں کرنا پڑا، صرف ایک سفید کنول دورے کے لیے روشن کر دیا گیا تھا۔ آٹھ بجتے بجتے سب احباب میر صاحب، آغا صاحب، خان صاحب، شیخ صاحب، پنڈت صاحب، وغیرہ وغیرہ تشریف لائے پہلے شیر فالودے کے ایک ایک پیالے کا دور چلا، پھر شعر و سخن کا چرچا ہونے لگا۔

منشی صاحب: تو پھر اہتمام آپ کیجیے بندہ شعر سنے۔

رسوا: معاف فرمائیے یہ درد سر مجھ سے نہ ہوگا۔

منشی صاحب: اچھا وہ مطلع کیا تھا۔

امراؤ: میں عرض کیے دیتی ہوں

کعبے میں جا کے بھول گیا راہ دیر کی

ایمان بچ گیا، مرے مولا نے خیر کی

منشی صاحب: خوب کہا ہے!

خان صاحب: اچھا مطلع ہے، مگر یہ ”بھول گیا“ کیوں؟

امراؤ جان: تو کیا خان صاحب میں ریختی کہتی ہوں؟

خان صاحب: مزاتور ریختی کا ہے۔ ”میرے مولا نے خیر کی“ آپ ہی کی

زبان سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔

رسوا: بس آپ کے حملے شروع ہو گئے، اے شعر سننے دیجیے خان

صاحب! دنیا میں اگر سب آپ ہی کے سے محقق ہو جائیں تو

شعر گوئی کا مزاتشریف لے جائے

ہر گلے راز نگ و بونے دیگر است



(تھوڑی دیر کے بعد)

امراؤ جان: آپ کی عنایت ہے تسلیم، تسلیم!

ہوس مال و زر نہیں ہوتی

امریکا:

ع: ورنہ میں کیا مری حقیقت کیا

امراء: (تسلیم کر کے)

امراؤ: تسلیم!

امراؤ: تسلیم!

امراؤ: تسلیم! منقطع ملاحظہ ہو:

رائے اس کے خلاف ہے۔

امراؤ: ذاتی تجربہ جو کچھ ہو میں نے تو ایک شاعرانہ مضمون کہا ہے۔



رسوا: اچھا ذرا پھر تو پڑھیے۔

امراؤ جان نے پھر پڑھا

رسوا: مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کے دونوں پہلو اس شعر سے نکلتے ہیں۔

خان صاحب: واقعی مرزا صاحب کیا بات کہی!

احباب: غزل از مطلع تا مقطع ایک رنگ میں ہے۔ اعلیٰ درجے کا مذاق ہے!

آغا صاحب: نشست الفاظ تو ملاحظہ کیجیے!

پنڈت صاحب: کیا درفشانی کی ہے!

امراء جان: (کھڑی ہو کے) ”تسلیم!“

غشی صاحب: خان صاحب اب آپ کچھ ارشاد کیجیے۔

خان صاحب: حضرت! مجھے تو معاف کیجیے کچھ یاد نہیں آتا۔

رسوا: کچھ تو پڑھیے۔

خان صاحب نے ایک مطلع اور دو شعر پڑھے:

حیف بنت العجب نہیں ملتی

ماہ میں ایک شب نہیں ملتی

رسوا: کیا اچھا کنایہ ہے یعنی شب چار دہم

خان صاحب: تسلیم!

یوں تو ملتی ہے داد صنعت شعر

داد حسن طلب نہیں ملتی

خان صاحب: تسلیم!

رسوا: کیا کہنا! خوب فرمایا!

شوخیوں سے کسی کی میری مراد

پہلے ملتی تھی اب نہیں ملتی

رسوا: لا جواب شعر کہا ہے۔

خان صاحب: تسلیم!

اس کے بعد ایک صاحب تشریف لائے۔ آدمی کے ہاتھ میں لائین تھی۔

خان صاحب: یہ کون صاحب آتے ہیں؟ شب ماہ میں لائین کی کیا ضرورت تھی؟

نواب صاحب: حضرت حماقت تو ہوئی معاف کیجئے گا۔

خان صاحب: اے نواب صاحب! یہ حضور مضائقہ ندارد۔

نواب صاحب تشریف لائے سب نے تعظیم کی۔ غزل پڑھنے کی فرمائش ہوئی۔

نواب صاحب: میں تو آپ صاحبوں کا مشتاق ہو کے آیا ہوں، مجھے تو کچھ یاد دلا دے۔

شیخ صاحب: جناب غزل پڑھنا ہوگی۔

نواب صاحب: اچھا، جو کچھ یاد آتا ہے، عرض کیے دیتا ہوں۔

دل میں کھب جائے گی قاتل کی ادا ایک نہ ایک

کارگر ہو گا کبھی تیر قضا ایک نہ ایک

احباب: سبحان اللہ! واہ وا! کیا مطلع فرمایا ہے۔

نواب صاحب: (جھک جھک کے تسلیمیں کرنے لگے) شعر ملاحظہ ہو:

کوئی حوروں پہ فدا، کوئی بتوں پر شیدا

ڈھونڈ ہی لیتے ہیں انسان، خدا ایک نہ ایک

احباب: واہ! کیا شعر کہا ہے!

نواب صاحب: تسلیم (اس کے بعد چپ ہوزے)

رسوا: اور کچھ ارشاد ہو۔

نواب صاحب: واللہ! اب کچھ یاد ہی نہیں آتا۔

منشی صاحب: پنڈت صاحب! اب آپ داد و فراحت دیجیے۔

پنڈت جی: اتنا لالکھام دو تین شعر عرض کیے دیتا ہوں:

وصل میں ذکر عدو بھی دم بہ دم ہوتا رہا  
شریت دیدار میرے حق میں سم ہوتا رہا

احباب: تعریف  
پنڈت جی:

زاہدو! دو دن سے چرچا حق پرستی کا ہوا  
ورنہ کعبے میں سدا ذکر صنم ہوتا رہا  
نواب صاحب: یہ ہم نہیں کہہ سکتے، مگر خوب کہا ہے!  
پنڈت صاحب: کہیے یا نہ کہیے، مگر بات سچی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:  
واعظا! کیوں سر جھکائے وہ کسی کے روبرو  
جس کا سر نقش قدم پر اس کے خم ہوتا رہا

احباب: تعریف  
پنڈت جی:

زلف کی تعریف میں دفتر کے دفتر لکھ دیے  
موت بہ مو حال پریشانی رقم ہوتا رہا  
یہ خاص لکھنو کا مذاق ہے۔

رسوا:

اور آپ دہلی کے کب ہیں؟

پنڈت جی:

اچھا شعر پڑھیے میں نے ایک بات کہی۔

رسوا:

پنڈت جی:

دل جو تھا پہلے گل، نو رستہ باغ مراد  
خار خار حسرت رنج و الم ہوتا رہا

نواب صاحب: دیکھیے کیا شعر کہا ہے!

خان صاحب: متانت الفاظ ملاحظہ ہو!

پنڈت جی: تسلیم! مقطع ملاحظہ ہو:

شکر یہ مخمور اس کا کب ادا تجھ سے ہوا



ہر نفس تجھ پر جو خالق کا کرم ہوتا رہا  
خان صاحب: سبحان اللہ! ہر نفس کے فردی رودمد حیات است و چوں بری آید  
مفرح ذات۔

رسوا: خان صاحب! آپ کے مارے تو شعر ہی پڑھنا مشکل ہے۔  
احباب: سبحان اللہ! کیا غزل فرمائی ہے!  
پنڈت جی: آپ کی عنایت پرورش بندہ نوازی۔ واللہ! یہ آپ ہی لوگوں کا  
صدقہ ہے۔

منشی صاحب: شیخ صاحب! آپ بھی تو کچھ ارشاد کیجیے۔  
شیخ صاحب: (مسکرا کر) جی مجھے تو کچھ یاد نہیں۔  
خان صاحب: یاد نہیں، مگر ستر شعر کی غزل جیب میں ہوگی۔  
شیخ صاحب: واللہ نہیں، صرف چار شعر ابھی موزوں کر لیے ہیں۔  
رسوا: تو پھر پڑھتے کیوں نہیں!  
شیخ صاحب: عرض کیے دیتا ہوں۔

عرض وہ عرض ہے جس میں کوئی اصرار نہ ہو  
بات وہ بات کہ جس بات سے انکار نہ ہو

احباب: تعریف  
شیخ صاحب: تسلیم!

منزل یوسف سر بازار پڑائے پھرتے ہو  
کیا ہی شرماؤ اگر کوئی خریدار نہ ہو  
رسوا: کیا اچھا مذاق ہے!  
شیخ صاحب: تسلیم

دل وہ اچھا جو حسینوں کی نظر میں نہ جھے  
جنس وہ خوب، کوئی جس کا خریدار نہ ہو  
خان صاحب: بہت خوب!

شیخ صاحب: تسلیم

قتل عشاق کی بے کار قسم کھاتے ہو  
ہم نہ مانیں گے اگر ہاتھ میں تلوار نہ ہو  
اتنے میں ایک آدمی آیا اور اس نے ایک پرچہ منشی احمد حسن کو دیا  
منشی صاحب: (رقعہ پڑھ کے) لیجیے مرزا صاحب تشریف نہیں لائیں گے  
غزل تازہ تصنیف بھیج دی ہے۔

میں نے آدمی سے پوچھا ”کرتے کیا ہیں؟“

آدمی: (مسکرا کے) جی حضور سکندر باغ سے سرشام بہت سے انگریزی  
درختوں کے ناندے لے کے آئے ہیں۔ ان کو گول حوض کے  
کنارے پتھروں کے اندر سجا رہے ہیں۔ مالی پانی دیتا جاتا ہے۔  
جی ہاں انہیں اپنے اعمال سے فرصت کہاں جو مشاعرے میں  
تشریف لائیں۔

منشی صاحب: واللہ کیا صحبت کو بے لطیف کیا ہے۔ نہ آئے نا اچھا غزل ہی پڑھ  
دیکھیے۔

رسوا: مجھ سے تو کچھ نہ پڑھو ایسے گا؟

منشی صاحب: ہاں خوب یاد آیا اچھا تو پہلے آپ پڑھ لیجیے

رسوا:

نہ پوچھو ہم سے کیوں کر زندگی کے دن گزرتے ہیں  
کسی بے درد کی فرقت میں جیتے ہیں نہ مرتے ہیں  
کوئی ان سے کہے دل لے کے بھی یوں ہی مکر جانا  
عدو کے سامنے جو گالیاں دے کر مکتے ہیں  
ابھی تو نہیں رہے ہیں مدعی ذوق جراحات پر  
نہ پوچھو اس مزے کو جب نمک زخموں میں بھرتے ہیں

تماشا ہو جو ان کا بوسہ لے کر ہم مکر جائیں  
 بہت جو چاہنے والوں کا دل لے کر مکتے ہیں  
 انہی کا نام لے لے کر کوئی فرقت میں مرتا ہے  
 کبھی تو وہ بھی سن لیں گے جو بدنامی سے ڈرتے ہیں  
 بگاڑا ہم کو قسمت نے تو پھر بننا نہیں ممکن  
 وہ گیسو ہیں کسی کے جو بگڑ کے پھر سنورتے ہیں  
 کبھی شانے سے الجھے وہ کبھی آئینے کو توڑا  
 سنورنے میں بگڑتے ہیں بگڑنے میں سنورتے ہیں  
 ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گی ادائیں ان کے جو بن کی  
 دوپٹہ اوڑھ کر آڑا جو چلنے میں ابھرتے ہیں  
 ادا سے ناز کو رسوا ہے دعویٰ پارسائی کا  
 کوئی پوچھے تو آخر مرنے والے کس پہ مرتے ہیں  
 احباب نے ہر شعر کی داد دی رسوا نے سر تسلیم خم کیا۔ اس کے بعد مرزا صاحب کی غزل پڑھنا  
 شروع کی:

کل رات کو انہیں جو کہیں دیر ہو گئی  
 دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی  
 مرنے کے دن قریب ہیں شاید کدے حیات  
 تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی  
 بیہودہ خواشوں نے نہ جینے دیا ہمیں  
 ان موزیوں سے عقل اگر زیر ہو گئی  
 اے موت! تجھ کو کیا ہوا تو ہی بلا سے آ  
 ان کو تو آتے آتے بہت دیر ہو گئی



میری تباہیوں کی تمہیں اب خبر ہوئی  
 کیا پوچھتے ہو عمر یوں ہی تیر ہو گئی  
 آج ان سے ہم نے آنے کا وعدہ کیا تو ہے  
 دم ہی نکل گیا جو کہیں دیر ہو گئی  
 ملنا تھا میرے پاس سے اے کاہلی تجھے  
 کبخت تو تو آ کے یہیں ڈھیر ہو گئی  
 دہکی ہوئی تھی گر بہ صفت خواہش گناہ  
 چکارنے سے پھول گئی شیر ہو گئی  
 مرزا مشاعرے میں نہ تشریف لائیں گے  
 تا چند انتظار؟ بڑی دیر ہو گئی

اس کے بعد مظہر الحق نامی ایک شاعر کہیں باہر کے رہنے والے جو اس وقت اتفاق سے  
 وارو مشاعرہ تھے انہوں نے یہ نظم پڑھی:

ہے ہمارے مشاعروں کا یہ حال  
 جس کی اب نقل کرتے ہیں نقال  
 روش اہل فن پہ ہنستے ہیں  
 رنگ بزم سخن پہ ہنستے ہیں  
 کیا زمانے میں عذر ہے توبہ  
 شاعری کی یہ قدر ہے توبہ  
 گو کہ پاس ادب نہیں کرتے  
 جو کچھ بے سبب نہیں کرتے  
 چلتے ہیں شاعران خوش تقریر  
 اپنے ہمراہ لے کے جم غفیر

کب سخن دور اکیلے جاتے ہیں  
 قدر دانوں کو لے کے آتے ہیں  
 جاتے ہیں معرکوں میں فوج سمیت  
 ساتھ ہوتے ہیں بے شمار پھندیت  
 جن کے ہم راہ یہ ہجوم نہ ہو  
 کبھی ان کی غزل کی دھوم نہ ہو  
 اک ادھر واہ واہ کرتا ہے  
 اک ادھر آہ آہ کرتا ہے  
 واہ کیا طرز ورفشانی ہے  
 واہ کیا وضع خوش بیانی ہے  
 کوئی کہتا ہے ”واہ کیا کہنا  
 فی الحقیقت ہے یہ نیا کہنا  
 اس سے بہتر کہے گا کیا کوئی  
 کب ہے استاد آپ سا کوئی  
 اس زمانے میں آپ یکتا ہیں  
 واقعی فخر میر و مرزا ہیں  
 کب میسر تھا ان کو حسن کلام  
 کچھ نہ تھے وہ فقط ہے نام ہی نام  
 ان کے دیواں میں کب یہ نشتر ہیں  
 بخدا! آپ ان سے بہتر ہیں  
 ان سے واللہ! آپ اچھے ہیں

ثم باللہ! آپ اچھے ہیں  
 کہیں بڑھ کے ہے آپ کا انداز  
 نکتہ سنجی ہے یا کہ ہے اعجاز  
 آپ قدرت نمائے معنی ہیں  
 فی الحقیقت خدائے معنی ہیں  
 آپ کے آگے کون منہ کھولے  
 کس کا مقدور ہے جو کچھ بولے  
 ہے یہ انداز آپ کا حصہ  
 ہے یہ اعجاز آپ کا حصہ  
 دل میں ہم خوب کر چکے ہیں غور  
 آپ ہی آپ ہیں 'نہیں' کچھ اور  
 آپ ایسے ہیں 'آپ ویسے ہیں  
 ہم سمجھتے ہیں آپ جیسے ہیں  
 آپ کیا قدر اپنی پہچانیں  
 پوچھیے ہم سے 'آپ کیا جانیں  
 آپ کا کام ہے ہوا بندی  
 آپ پر ختم ہے ادا بندی  
 ایسے شاعر ہوئے تھے کب پیدا  
 نہ ہوئے تھے نہ ہوں گے اب پیدا  
 الغرض بے تکی اڑاتے ہیں  
 بچھے جاتے ہیں 'لوٹے جاتے ہیں



ان کی تعریف ہے وہ لا طائل  
 جس سے دکھتا ہے دوسروں کا دل  
 منہ سے وہ شعر ادھر نکالتے ہیں  
 یہ ادھر ٹوپیاں اچھالتے ہیں  
 جن کی تعریف کا تھا یہ مذکور  
 اپنے دل میں بہت ہی ہیں سرور  
 اگر اس میں کسی کو غصہ آئے  
 کچھ تعجب نہیں کہ لٹھ چل جائے  
 نہیں یہ بات کچھ تعجب کی  
 بلکہ اکثر ہوا ہے ایسا بھی  
 پڑھتے ہیں لفظ لفظ رک رک کے  
 ہو رہے ہیں سلام جھک جھک کے  
 گو بہ ظاہر ہے انکسار بہت  
 دل میں ہے جوش افتخار بہت  
 کس قدر تنے ہیں بررتے ہیں  
 خود بھی تعریف اپنی کرتے ہیں  
 ہوتی ہے لفظ لفظ کی تشریح  
 ہوتی ہے بات بات کی تصریح  
 کیوں نہ ہوں اپنی مدح کے شائق  
 جانتے ہیں کہ ہم ہیں اس لائق  
 کس قدر دوز ہیں معاذ اللہ!

کیسے مغرور ہیں مغاز اللہ!  
 نکتہ فہم ایسے نکتہ داں ایسے  
 شاعر ایسے ہیں قدر داں ایسے  
 جھوٹی تعریف کی حقیقت کیا  
 جب حقیقت نہ ہو تو لذت کیا  
 اس میں کیا حظ ہے یہ مزا کیا ہے  
 کوئی پوچھے انہیں ہوا کیا ہے  
 گو کہ میری مذمتیں ہوں گی  
 میں سمجھتا ہوں جو گتیں ہوں گی  
 صاف گوئی کی داد پاؤں گا  
 میں بھی اپنی مراد پاؤں گا  
 کیا غرض ہے جو میں کسی سے ڈروں  
 بات سچی ہے کیوں نہ کہہ گزروں  
 مجھ کو بھاتی نہیں لگی لپٹی  
 بلکہ آتی نہیں لگی لپٹی  
 طرز اہل سخن سے ناخوش ہوں  
 روش اہل فن سے ناخوش ہوں  
 شاعری ہے اگر اسی کا نام  
 دور سے ایسی شاعری کو سلام

اس نظم کی انصاف پسند احباب نے بڑی تعریف کی۔ ہر شعر پر اہل محفل تعریف کرتے  
 جاتے تھے۔ منشی صاحب پر و جد کا عالم طاری تھا 'امراؤ جان جھوم رہی تھیں۔ اور میرا جو حال تھا وہ  
 میرے ہی دل سے کوئی پوچھے۔

منشی صاحب: ہاں جناب آغا صاحب! اب آپ کچھ عنایت فرمائیے۔  
آغا صاحب: بہت خوب! مطلع اول ملاحظہ ہو۔

کہیں سامان ایسے ہوں تو کچھ دل کو مرے کل ہو  
مٹا بلے ہوئے ہوں اور اک ٹھرے کی بوتل ہو  
احباب: آغا صاحب! کیا مقطع فرمایا ہے!

آغا صاحب: اے حضرت! ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے دوسرا مطلع سنئے۔

وہ مضمون ڈھونڈ کر باندھوں کہ جو شکل سے شکل ہو

کہوں وہ مطلع ثانی کہ جو اول سے اول ہو

احباب: بے شک اول سے اول ہے۔

آغا صاحب: لے اب شعر ملاحظہ ہوں:

(اس شعر کا رخ نواب صاحب کی طرف تھا جو جالی کا کرتا ہلکا بادامی رنگا اور باریک ململ کا  
انگر کھا پہنے بند کھولے ہوئے بیٹھے تھے اور ایک نہایت نفیس پنکھیا ہاتھ میں تھی اسے جھلتے جاتے  
تھے)

اگر جاڑے میں تو مل جائے تو کیا غم ہے جاڑے کا

تری زلفیں ہوں شانے پر دو شالہ ہو نہ کمل ہو

احباب: تعریف

آغا صاحب:

کہو بے چارگی میں بھی طبیعت خوش رکھے مجنوں

کہ چر لے ناقہ لیلیٰ ہری جب دل کی کوئل ہو

پنڈت جی: سبحان اللہ! اور تو اور یہ بے چارگی سے کیا چارہ نکالا ہے!

احباب: واللہ سمجھے بھی خوب! سمجھ ہو تو ایسی ہو نہیں تو نہ ہو۔

آغا صاحب: نہ ہو! اچھا اب یہ شعر سنئے:

کہو عشاق سے اپنے کہ ضبط گریہ فرمائیں

رکے گا راستہ گھر کا اگر کوچے میں دلدل ہو



شیخ صاحب: اچھی کہی!

رسوا: (خان صاحب سے) آپ کیوں سکوت میں ہیں؟ کوئی اعتراض نکالیے؟

آغا صاحب: ہاں جناب! سکوت قدر شناس ٹھیک نہیں ہے۔

خان صاحب: آپ میری تعریف کو تحسین ناشناس نہ سمجھیے؟ اس لیے چپ ہوں۔

آغا صاحب: نہیں حضرت! میری ایسی الٹی سمجھ نہیں ہے۔ احباب اس فقرے پر لوٹ گئے۔

آغا صاحب: ملاحظہ ہو۔

ہمیں رشک آئے اپنے سے ہمیں سے غیر پیدا ہو

ہم ایسے دو نظر آئیں اگر معشوقِ احوال ہو

احباب: آغا صاحب! سبحانہ اللہ! کیا نازک خیالی ہے۔

آغا صاحب:

ابھی کم سن ہیں ان کو شوق ہے لنگڑ لڑانے کا

تکلا ڈور کا ہو اک نہ کنکلیا نہ تکل ہو

اس شعر کا رخ بھی نواب صاحب کی جانب تھا اس لیے کہ آپ ہی کی سرکار عالی جاہ سے

کنکوے کی برات بڑی دھوم سے نکلی تھی۔

آغا صاحب:

کوئی ان سے کہے جو شعر معنی بند کہتے ہیں

کھلے کیا راز سربستہ جو دروازہ مقفل ہو

رسوا: آغا صاحب! کیا کہنا! امر او جان! ذرا سننا کیا شعر کہا ہے۔

امراؤ جان: سبحان اللہ! میں پہلے ہی سمجھ گئی۔ جو چاہیں کہیں مالک ہیں۔

آغا صاحب: تو صاف کیوں نہیں کہتیں کہ دوزخ کا دربان ہوں۔ اچھا سنئے۔

کسی صورت سے بہلا لیں گے اس معشوق کم سن کو

ڈبل پیسہ نہ ہو، ریوڑی نہ ہو تو گول گپن ہو

احباب: کیا کہنا!

آغا صاحب:

کبھی گالی سنا بیٹھے، کبھی جوتے لگا بیٹھے

حکومت کا مزا آئے اگر معشوق ارذل ہو

خان صاحب: درست، مگر آپ کی شرافت سے بعید ہے۔

آغا صاحب: جناب شریف کون ہے اس زمانے میں۔

خدا کے فضل سے اترا تھا کیا ہی عرش سے جوڑا

نہ مجھ سا کوئی گرگا ہو نہ تم سی کوئی شغل ہو

نواب صاحب: خوب! مگر روئے سخن کس کی طرف ہے؟

آغا صاحب: یہ تو آپ ہی خوب سمجھ سکتے ہیں، اس لیے کہ آپ محرم راز ہیں۔

السوء عند کرام الناس مکتوم۔

خان صاحب: آپ جواب دیجیے۔

آغا صاحب: آپ کیا جواب دیں گے۔ یہ شعر سنئے۔

ہم اس نازک ادا کی شوخیوں پر جان دیتے ہیں

شتر کے جس میں غمزے ہوں، فرس کی جس میں جھلبل ہو

احباب: واہری ہمت!

آغا صاحب: اچھا نہ سہی یہ سنئے۔

میں دل کو چیر ڈالوں گا جو تم پہلو سے اٹھ جاؤ

میں آنکھیں پھوڑ ڈالوں گا جو تم آنکھوں سے اوجھل ہو

احباب: خوب!

آغا صاحب:

تمہاری سادگی میں کچھ عجب عالم نکلتا ہے

نہ چوٹی ہوئے کنگھی ہوئے مسی ہوئے کا جل ہو

امراد جان: اوئی! تو کیا دن رات سر جھاڑ منہ پہاڑ بیٹھا رہے؟  
آغا صاحب: سادگی کا یہی مزا ہے اور دوسرے خرچ کی بھی کفایت ہے۔  
(اس مذاق میں لطف یہ ہے کہ امراد جان کسی قدر خسیس مشہور تھیں)۔

احاب: لگا ہم سے وہ جب مانگیں انہیں چپکے سے ہم دے دیں  
نہ بک بک ہوئے جھک جھک ہوئے کچ کچ ہوئے کل کل ہو  
کیا مصرع کہا ہے!

خان صاحب: اوپر کا مصرع بھی خوب لگایا ہے۔ وہی ارذل کی رعایت چلی آتی ہے۔

(امراد جان ہنستے ہنستے لوٹی جاتی تھیں)۔

آغا صاحب: اچھا تو اب ایسے شعر نہ پڑھیں گے۔ ہمارا معشوق ذلیل ہوا جاتا ہے۔ نازک خیالی سنئے۔

تری نازک کمر کے باب میں چہلک بنا دیں گے  
وہ کیا سمجھے یہ باریکی طبیعت جس کی ٹٹھل ہو  
خان صاحب: میں تسلیم کیے لیتا ہوں میری طبیعت ایسی ہی ہے جیسا آپ  
ارشاد فرماتے ہیں مگر برائے خدا اس چہلک کے معنی سمجھا دیجیے۔

آغا صاحب: خیر خاطر ہے سن لیجیے۔ محاسب لوگ خانہ پری کے لیے بجائے  
ندارد کے (X) نشان بنا دیا کرتے ہیں اس لیے اس سے یہ  
مطلب نکلا کہ کمر معدوم ہے۔ دوسرے ایک خط نے بیچوں بیچ  
سے دوسرے کو کاٹ دیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوا کہ معشوق کی کمر  
کٹی ہوئی اور پھر جڑی ہوئی ہے۔

خان صاحب: یہ کیوں کر؟

آغا صاحب: اب اس بار کی کونہ پوچھیے۔ خیر حضرات واضح ہو کہ چہلک علم ریاضی میں علامت جمع کی ہے۔ لطف یہ ہے کہ علامت کی کوئی مقدار نہیں ہوتی۔

مطلب یہ نکلا کہ کمر باد جو دمعدوم ہونے کے جسم کے دونوں حصوں کو جوڑے ہوئے ہے۔  
احباب: حضرت! بس نازک خیالی کی حد ہو گئی! جو کوئی اتنا علم جانتا ہو وہ آپ کے شعر سمجھے۔

آغا صاحب: اسی لیے تو میں ایسے ویسوں کے سامنے پڑھتا نہیں۔ افسوس! استاد مرحوم زندہ نہ ہوئے، نہیں تو ان شعروں کی کچھ داد ملتی۔ اب سمجھنے والوں میں کون رہ گیا ہے۔ خیر آپ یہ مقطع سن لیجے۔  
طبیعت کو کوفت ہو گئی، کوئی قدر دان نہیں ہے۔

بس اے قزاق بس! طبع قیامت خیز کو روکو

غضب ہو جائے گا فوج مضامین میں جو ہلچل ہو

احباب: مقطع پھر عنایت ہو۔ (آغا صاحب نے دوبارہ پڑھا)۔

نواب صاحب: کیا زبردست تخلص رکھا ہے، قزاق!

آغا صاحب: معاف فرمائیے گا، ہے تو کچھ ایسا ہی، مگر کچھ ایسا نازیبا نہیں ہے۔

ایک تو خاندانی اعتبار سے اس لیے کہ فدوی کے آباؤ اجداد

دشت قبیاق میں لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ دوسرے اس سبب

سے کہ استاد مرحوم سارق تخلص فرماتے تھے اور یہ کچھ

ایسا نامناسب بھی نہ تھا اس لیے کہ (ان کی روح نہ شرمندہ ہو)

عمر بھر اگلے شاعروں سے مضمون چرا چرا کے شعر موزوں فرمایا

کیے۔ سارا دیوان ملاحظہ کر لیجے شاید ہی کوئی شعر نیا ہو۔ جب

اشب خامہ کی لگام میرے دست اقتدار میں آئی تو میں نے

سرتے کو اپنی شان کے منافی سمجھ کے قزاق تخلص رکھ لیا۔ کچھ نہ

سہی اس میں ایک طرح کا بائپین تو ہے۔ بندے کا یہ دستور رہا



ہے اور رہے گا کہ شعرائے ماضی و حال و استقبال کے مضامین  
زبردستی چھین کر اپنے قبضہ تصرف میں کر لوں گا۔

نواب صاحب: بہت مبارک!

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد فالسے کی برف جمائی گئی، اس کی دو دو قفلیاں احباب نے نوش  
کیں۔ سب اپنے اپنے مکان تشریف لے گئے۔ اس کے بعد دسترخوان بچھا۔ منشی صاحب نے  
اور میں نے اور امر او جان نے کھانا کھایا۔

منشی صاحب: (امراؤ جان سے) ذرا اپنا وہ مقطع پڑھیے جو آپ نے پہلے پڑھا  
تھا۔

امراؤ جان:

کس کو سنائیں حال دل زار اے ادا

آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

منشی صاحب: اس میں شک نہیں کہ آپ کے حالات بہت ہی دل چسپ ہوں  
گے۔ جب سے آپ نے یہ مقطع پڑھا ہے مجھے یہی خیال ہے۔  
اگر آپ اپنی سرگزشت بیان کریں تو لطف سے خالی نہ ہوگا۔

میں نے بھی منشی صاحب کے کلام کی تائید کی، مگر امر او جان پہلو بچاتی تھیں۔ ہمارے منشی  
صاحب مہربان کو ابتدائے سن سے قصے کہانیوں کا بڑا شوق تھا۔ ”الف لیلہ“، امیر حمزہ کی داستان  
کے علاوہ ”بوستان خیال“ کی کل جلدیں نظر سے گزری ہوئی تھیں۔ کوئی ناول ایسا نہ تھا جو آپ نے  
نہ دیکھا ہو، مگر لکھنؤ میں چند روز رہنے کے بعد جب اہل زبان کی اصل بول چال کی خوبی کھلی، اکثر  
ناول نویسوں کے بے تکے قصے، مصنوعی زبان اور تعصب آمیز بیہودہ جوش دلانے والی تقریریں  
آپ کے دل سے اتر گئی تھیں۔ لکھنؤ کے بانداق لوگوں کی گفتگو بہت ہی پسند آئی تھی۔ امر او جان  
کے اس مقطع نے آپ کے دل میں وہ خیال پیدا کیا جس کا اشارہ اوپر کیا گیا ہے۔ القصہ منشی  
صاحب کے شوق اور میری اشتعا لک نے امر او جان کو مجبور کیا اور وہ اپنی سرگزشت کہنے پر راضی ہو  
گئیں۔

اس میں شک نہیں کہ امر او جان کی تقریر بہت شستہ تھی۔ اور کیوں نہ ہو، اول تو خواندہ

دوسرے اعلیٰ درجے کی رنڈیوں میں پرورش پائی، شہزادوں اور نواب زادوں کی صحبت اٹھائی، محلات شاہی تک کی رسائی ہوئی۔ جو کچھ انہوں نے آنکھوں سے دیکھا، اور لوگوں نے کانوں سے نہ سنا ہوگا۔

اپنی سرگزشت وہ جس قدر کہتی جاتی تھیں، میں ان سے چھپا کے لکھتا جاتا تھا۔ تمام ہونے کے بعد میں نے مسودہ دکھایا۔ اس پر امراد جان بہت ہی بگڑیں مگر اب کیا ہوتا۔ آخر کچھ سمجھ بوجھ کے چپ ہو رہیں۔ خود پڑھا اور جا بہ جا جو کچھ رہ گیا تھا، اسے درست کر دیا۔

میں امراد جان کو اس زمانے سے جانتا ہوں جب ان کی نواب..... صاحب سے ملاقات تھی۔ انہی دنوں میری نشست بھی اکثر وہاں رہتی تھی۔ اس سرگزشت میں جو کچھ بیان ہوا، مجھے اس کے حرف بہ حرف صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، مگر یہ میری ذاتی رائے ہے، ناظرین کو اختیار ہے جو چاہیں قیاس کر لیں۔

مرزا رسوا

لکھنؤ مارچ ۱۸۹۹ء

# حصہ اول

لطف ہے کون سی کہانی میں

آپ بتی کہوں کہ جگ بتی

سنیے مرزا رسوا صاحب! آپ مجھ سے کیا چھیڑ چھیڑ کے پوچھتے ہیں۔ مجھ کم نصیب کی سرگزشت میں ایسا کیا مزا ہے جس کے آپ مشتاق ہیں۔ ایک ناشاد نامراد آوارہ وطن خانماں برباد تنگ خاندان عار و جہان کے حالات سن کے مجھے ہرگز امید نہیں کہ آپ خوش ہوں۔ اچھا سنیے اور اچھی طرح سنیے:

باپ دادا کا نام لے کر اپنی سرخ روئی جتانے سے فائدہ کیا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد بھی نہیں۔ ہاں اتنا جانتی ہوں کہ فیض آباد میں شہر کے کنارے کسی محلے میں میرا گھر تھا۔ میرا مکان پختہ تھا۔ آس پاس کچھ کچے مکان، کچھ جھونپڑے، کچھ کھیریلیں۔ رہنے والے بھی ایسے ہی ویسے لوگ ہوں گے۔ کچھ بہشتی، نائی، دھوبی، کہہاڑ۔ میرے مکان کے سوا ایک اونچا گھر اس محلے میں اور بھی تھا۔ اس مکان کے مالک کا نام دلا اور خان تھا۔

میرے ابا بہو بیگم صاحبہ کے مقبرے پر نوکرتھے۔ معلوم نہیں کا ہے میں اسم تھا، کیا تنخواہ تھی۔ اتنا یاد ہے کہ لوگ ان کو جمعدار کہتے تھے۔

دن بھر اپنے بھائی کو کھلایا کرتی تھی اور وہ مجھ سے اس قدر ہلا ہوا تھا کہ دم بھر کے لیے نہ چھوڑتا تھا۔

ابا جب شام کو نوکری پر سے آتے تھے اس وقت کی خوشی ہم بھائی بہنوں کی کچھ نہ پوچھیے۔ میں کمر سے لپٹ گئی، بھائی ابا ابا کر کے دوڑا دامن سے چٹ گیا۔ ابا کی ہاتھیں مارے خوشی کے کھلی جاتی ہیں۔ مجھ کو چکارا پیٹھ پر ہاتھ پھیرا، بھیا کو گود میں اٹھالیا، پیار کرنے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ کبھی خالی ہاتھ گھر نہ آتے تھے۔ کبھی دو کتارے ہاتھ میں ہیں۔ کبھی بتاشوں اور تل کے لڈوؤں کا دو نا ہاتھ میں ہے۔ اب اس کے حصے لگائے جا رہے ہیں۔ اس وقت بھائی بہنوں میں کس مزے کی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ وہ کتارا چھینے لیے جاتا ہے، میں مٹھائی کا دو نا ہتھیا لیتی ہوں۔ اماں سامنے کھیریل میں بیٹھی کھانا پکا رہی ہیں۔ اب ادھر آ کے بیٹھے نہیں ادھر میرے تقاضے



شروع ہو گئے۔ ”ابا! اللہ! گڑیاں نہیں لائے۔ دیکھو! میرے پاؤں کی جوتی کیسی ٹوٹ گئی ہے، تم کو تو خیال ہی نہیں رہتا۔ لو! ابھی تک میرا طوق سنار کے ہاں سے بن کر نہیں آیا۔ چھوٹی خالہ کی لڑکی کی دودھ بڑھائی ہے، ابھی میں کیا پہن کے جاؤں گی؟ چاہے کچھ ہو عید کے دن تو میں نیا جوڑا پہنوں گی۔ ہاں میں تو نیا پہنوں گی۔“ جب اماں کھانا پکا چکیں، مجھے آواز دی۔ میں گئی، روٹی کی نوکری اور سالن کی پتیلی اٹھالائی۔ دسترخوان بچھا، اماں نے کھانا نکالا، سب نے سر جوڑ کے کھانا کھایا، خدا کا شکر ادا کیا۔ ابا نے عشاء کی نماز پڑھی، سو رہے۔ صبح کو بڑے ابا اٹھے، نماز پڑھی، اسی وقت میں کھڑک سے اٹھ بیٹھی، پھر فرمائشیں شروع ہوئیں:

”میرے ابا! آج نہ بھولنا، گڑیاں ضرور لیتے آنا۔ ابا! شام کو بہت سارے امرود اور نارنگیاں لانا۔“ ابا صبح کی نماز پڑھ کے وظیفہ پڑھتے ہوئے کوٹھے پر چڑھ جاتے تھے، کبوتروں کو کھول کے دانہ دیتے تھے، ایک دو ہوا میں اڑاتے تھے۔ اتنے میں اماں جھاڑو بہارو سے فراغت کر کے کھانا تیار کر لیتی تھیں، کیوں کہ ابا پھر دن چڑھنے سے پہلے ہی نوکری پر چلے جاتے تھے۔ اماں سینے پر ونے بیٹھ جاتی تھیں۔ میں بھیا کو لے کے کہیں محلے میں نکل گئی، یادروازے پر اٹلی کا درخت تھا، وہاں چلی گئی۔ ہجولی لڑکے لڑکیاں جمع ہوئے، بھیا کو بٹھا دیا، خود کھیل میں مصروف ہو گئی۔ ہائے کیا دن تھے! کسی بات کی فکر ہی نہ تھی۔ اچھے سے اچھا کھاتی تھی اور بہتر سے بہتر پہنتی تھی۔ کیوں کہ ہجولی لڑکے لڑکیوں میں کوئی مجھے اپنے سے بہتر نظر نہ آتا تھا۔ دل کھلا ہوا نہ تھا، نگاہیں بھٹی ہوئی نہ تھیں۔ جہاں رہتی تھی وہاں کوئی مکان میرے مکان سے اونچا نہ تھا اور سب ایک کٹھریا یا کپھریل میں رہتے تھے۔ میرے مکان میں آٹے سا منے دو دالان تھے۔ صدر کے دالان کے آگے۔ کپھریل پڑی ہوئی دو کھڑکیاں تھیں۔ دالان کے سامنے باورچی خانہ تھا، دوسری طرف کوٹھے کا زینہ، کوٹھے پر ایک کپھریل، دو کوٹھریاں۔ کھانے پکانے کے برتن ضرورت سے زیادہ تھے۔ دو چار دریاں، چاند نیاں بھی تھیں۔ ایسی چیزیں محلے کے لوگ ہمارے گھر سے مانگنے آتے تھے۔ ہمارے گھر میں بہشتی پانی بھرتا تھا، محلے کی عورتیں خود ہی کنویں سے پانی بھر لاتی تھیں۔ ہمارے ابا جب گھر سے وردی پہن کر نکلتے تھے، تو لوگ انہیں جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ میری اماں ڈولی پر سوار ہو کے مہمان جاتی تھیں، ہمسایاں پاؤں پیدل ماری ماری پھرتی تھیں۔

صورت شکل میں بھی اپنی ہجولیوں سے اچھی تھی۔ اگرچہ درحقیقت خوب صورتوں میں میرا شمار نہیں ہو سکتا، مگر ایسی بھی نہ تھی جیسی اب ہوں۔ کھلتی ہوئی چمپئی رنگت تھی، ناک نقشہ بھی خیر سے

کچھ ایسا برا نہ تھا۔ ماتھا کسی قدر اونچا تھا، آنکھیں بڑی بڑی تھیں، بچپن کے پھولے پھولے گال تھے۔ ناک اگرچہ ستواں نہ تھی، مگر چٹنی اور پہیہ پھری بھی نہ تھی۔ ڈیل ڈول بھی سن کے موافق اچھا تھا، اگرچہ اب ویسی نہیں رہی۔ نازکوں میں میرا شمار نہ جب تھا نہ اب ہے۔ اس قطع پر پاؤں میں لال گل بدن کا پائے جامہ چھوٹے چھوٹے پائینچوں کا، ٹول کا نیفہ، نینو کی کرتی، تن زیب کی اور ڈھنی ہاتھوں میں چاندی کی تین تین چوڑیاں، گلے میں طوق، ناک میں سونے کی نتھنی اور سب لڑکیوں کی نتھنیاں چاندی کی تھیں۔ کان ابھی ابھی تازے تازے چھدے تھے۔ ان میں صرف نیلے ڈورے پڑے تھے۔ سونے کی بالیاں بننے کو گئی تھیں۔

میری شادی میری پھوپھی کے لڑکے کے ساتھ ٹھہری تھی۔ منگنی نو برس کے سن میں ہو گئی تھی۔ اب ادھر سے شادی کا تقاضا تھا۔ میری پھوپھی نواب گنج میں بیاہی ہوئی تھی۔ پھوپھا ہمارے زمیندار تھے۔ پھوپھی کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ بھرا پڑا تھا۔ منگنی ہونے سے پہلے میں کئی مرتبہ اپنی ماں کے ساتھ جا چکی تھی۔ وہاں کے کارخانے ہی اور تھے۔ مکان تو کچا تھا، مگر بہت وسیع۔ دروازے پر چھپر پڑے ہوئے تھے۔ گائے، بیل، بھینسیں بندھی تھیں۔ گھی دودھ کی افراط تھی، اناج کی کثرت۔ بھٹوں کی فصل میں ٹوکروں بھٹے چلے آتے ہیں۔ کتاروں کی پھاندیاں کی پھاندیاں پڑی ہوئی ہیں۔ ادھ کے ڈھیر لگے ہوئے، کوئی کہاں تک کھائے۔

میں نے اپنے دولہا (یعنی جس کے ساتھ میری نسبت ٹھہری تھی) کو بھی دیکھا تھا، بلکہ ساتھ کھیلی تھی۔ ابا پورا جہیز کا سامان کر چکے تھے، کچھ روپے کی اور فکر تھی۔ رجب کے مہینے میں شادی کا تقرر ہو گیا تھا۔

رات کو ابا اماں میں جب میری شادی کی باتیں ہوتی تھیں تو میں چپکے چپکے سنا کرتی تھی اور دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔ واہ! میرے دولہا کی صورت کریمن (ایک دھینے کی لڑکی کا نام تھا جو میرے ہم سن تھی) کے دولہا سے اچھی ہے۔ وہ تو کالا کالا ہے، میرا دولہا گورا گورا ہے۔ کریمن کے دولہا کے منہ پر کیا بڑی سی داڑھی ہے، میرے دولہا کے ابھی موٹھیں بھی اچھی طرح نہیں نکلیں۔ کریمن کا دولہا ایک میلی سی دھوتی باندھے رہتا ہے، ماشی رنگی ہوئی مرزئی پہنتا ہے۔ میرا دولہا عید کے دن کس ٹھانڈے سے آیا تھا۔ سبز چھینٹ کا دگلا، گلبدن کا پانجامہ، مصالے کی ٹوپی، محلی جوتا۔ کریمن کا دولہا سر میں ایک پھینٹا باندھے ہوئے بنگے پاؤں پھرتا ہے۔

غرض کہ میں اپنی حالت میں خوش تھی اور کیوں نہ ہوتی، کیوں کہ اس سے بہتر اور کوئی

حالت میرے خیال میں نہ آ سکتی تھی۔ مجھے اپنی تمام آرزوئیں بہت ہی جلد پوری ہوتی معلوم ہوتی تھیں۔

مجھے یاد نہیں کہ جب تک میں اپنے ماں باپ کے گھر میں رہی، مجھے کوئی صدمہ پہنچا ہو، مگر ایک مرتبہ جب میری انگلی کا ایک چھلا چنداڑھیری کھیلنے میں جاتا رہا تھا۔ مواچاندی کا تار تھا شاید ایک آنے سے زیادہ کا نہ ہوگا۔ یہ اب کہتی ہوں اس وقت اتنی تمیز کہاں تھی، قیمت کسی چیز کی مجھے معلوم ہی نہ تھی۔ اس چھلے کے لیے میں اتار دئی کہ آنکھیں سو ج گئیں۔ اماں سے دن بھر چھپایا۔ آخر جب رات کو انہوں نے انگلی خالی دیکھی، مجھ سے حال پوچھا۔ اب کہنا ہی پڑا۔ اماں نے ایک طمانچہ میرے منہ پر مارا۔ میں چیخیں مار مار کر رونے لگی، ہچکیاں بندھ گئیں۔ اتنے میں ابا آ گئے۔ انہوں نے مجھے چمکارا، اماں پر خفا ہوئے۔ اس وقت میرے دل کو کسی قدر تسکین ہوئی۔

بے شک ابا مجھے اماں سے زیادہ چاہتے تھے۔ ابا نے کبھی پھول کی چھڑی نہیں چھوائی، اماں ذرا سی بات پر مار بیٹھتی تھیں۔ اماں چھوٹے بھیا کو بہت چاہتی تھیں۔ چھوٹے بھیا کے لیے میں نے بہت مار کھائی، مگر پھر بھی مجھے اس سے انتہائی محبت تھی۔ اماں کی ضد سے تو کبھی کبھی دو دو پہر میں نے اسے گود میں نہیں لیا، مگر جب ان کی آنکھ اوجھل ہوئی فوراً گلے سے لگا لیا، گود میں اٹھالیا، پیار کر لیا۔ جب دیکھا اماں آتی ہیں، جلدی سے اتار دیا۔ اب وہ رونے لگا۔ اس پر اماں یہ سمجھتی تھیں کہ میں نے رلا دیا، لگیں گھر کیا دینے۔

یہ کچھ تھا، مگر جہاں میری انگلی دکھی اور اماں نے قرار ہو گئیں۔ کھانے پینے کا ہوش نہیں، راتوں کی نیند حرام، کسی سے دوا پوچھتی ہیں، کسی سے تعویذ منگاتی ہیں۔

میرے جہیز کے لیے اپنے گلے کا سب گہنا اتار کے ابا کے حوالے کیا کہ اس میں تھوڑی چاندی ملو، کے پھر سے بنوادو۔ دو ایک عدد جوئے بنے ہوئے ہیں ان کو اجلا دو۔ گھر بھر کے برتنوں میں سے دو چار رکھ لیے، باقی نکال کے علیحدہ کر دیے کہ ان پر قلعی کرادو۔ بلکہ ابا نے کہا بھی کہ اپنے آئندہ کا بھی خیال رکھو۔ اماں نے کہا ”اوہ جی ہوگا تمہاری بہن زمیندار کی بیوی ہے، وہ بھی تو جانیں کہ بھائی نے لڑکی کو کچھ دیا۔ لاکھ تمہاری بہن ہیں، سسرال کا نام برا ہوتا ہے، میری لڑکی بنگلی بوچی جائے گی تو لوگ طعنے دیں گے۔“

مرزا برسا صاحب! میں نے اپنے ماں باپ کے گھر اور بچپن کی حالت کا پورا نقشہ آپ کے سامنے کھینچ دیا ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر میں اس عالم میں رہتی تو خوش رہتی یا ناخوش، اسے



آپ خود قیاس کر سکتے ہیں۔ میری ناقص عقل میں تو یہ آتا ہے کہ میں اسی حالت میں اچھی رہتی۔

ابتدا آوارگی کی جوش و خشت کا سبب

ہم تو سمجھے ہیں مگر ناصح کو سمجھائیں گے کیا

میں نے لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ جو ذات کی رنڈیاں ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا، جو کچھ نہ کریں کم ہے، کیوں کہ وہ ایسے گھر اور ایسی حالت میں پرورش پاتی ہیں جہاں سوائے بدکاری کے اور کسی چیز کا تذکرہ ہی نہیں۔ ماں بہن جس کو دیکھتی ہیں اسی حالت میں ہے، مگر یہ ماں باپ کی بیٹیاں جو اپنے گھروں سے نکل کے خراب ہو جاتی ہیں ان کو وہاں مارے جہاں پانی نہ ملے۔

میرا حال جتنا میں بیان کر چکی ہوں اتنا ہی کہہ کے چھوڑ دوں اور اس کے بعد یہ کہہ دوں کہ بس اس کے بعد میں آوارہ ہو گئی، اس سے یہ خیال پیدا ہو گا کہ کم بخت ادا ماتی تھی، شادی ہونے میں دیر ہوئی، کسی سے آنکھ لگا کے نکل آئی۔ اس نے چھوڑ دیا، کسی اور سے آشنائی کی۔ اس سے بھی نہ بنی، آخر رفتہ رفتہ یہی پیشہ ہو گیا۔ واقعی اکثر ایسا ہوتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سی بہو بیٹیوں کو خراب ہوتے دیکھا اور سنا۔ اس کے سبب بھی کئی ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جوان ہو گئیں، ماں باپ شادی نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ شادی اپنی پسند سے نہیں ہوتی۔ ماں باپ نے جہاں چاہا جھونک دیا۔ نہ سن کا لحاظ کیا، نہ صورت شکل دیکھی، نہ مزاج کا حال دریافت کیا۔ میاں سے نہ بنی، نکل کھڑی ہوئیں۔ یا جوانی میں سر پر آسمان ٹوٹا، رانڈ ہو گئیں۔ مگر مجھ بد نصیب ناشدنی کو بخت و اتفاق نے مجبور کر کے ایسے جنگل میں چھوڑ دیا جہاں سوائے گم راہی کے کوئی راستہ ہی نہ تھا۔

دلاور خاں، جس کا مکان ہمارے مکان سے تھوڑی دور تھا، مواد کیتوں سے ملا ہوا تھا۔ لکھنؤ میں برسوں قید رہا۔ اسی زمانے میں نہیں معلوم کس کی سفارش سے چھوٹ آیا تھا۔ ابا سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ وہ یہ تھی کہ جب فیض آباد میں یہ گرفتار ہوا تو محلے سے اس کے چال چلن کی تحقیقات کے لیے لوگ طلب ہوئے۔ ان میں ابا بھی تھے۔ ابا بے چارے یوں بھی دل کے سادے اور زبان کے سچے تھے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ گرائی والے صاحب نے ان کے ہاتھ میں قرآن دے کے پوچھا، ”دل جمعہ دار! تم سچ سچ کہے یہ کیسا آدمی ہے؟“ ابا نے صاف صاف جو اس کا حال تھا کہہ دیا۔ وہی کینہ اس کے دل میں چلا آتا تھا۔ اب کی وجہ قید سے چھوٹ کر آیا تو اس نے ابا کی ضد پر کبوتر پالے۔ ایک دن اس نے ابا کا ایک کبوتر اڑا لیا۔ لینے گئے نہ دیا۔ چار آنے



دیتے تھے وہ آٹھ آنے مانگتا تھا ابا تو نوکری پر چلے گئے جھٹ پٹے وقت خدا جانے میں گھر سے کیوں نکلی تھی دیکھتی کیا ہوں امی کے نیچے کھڑا ہوا ہے۔ کہنے لگا ”چلو بیٹا تمہارے ابا پیسے دیتے گئے تھے کبوتر لے لو۔“ میں اس کے دام میں آ گئی ساتھ چلی گئی۔ جا کے دیکھتی ہوں گھر میں کانی چڑیا نہیں۔ اکیلا مکان پڑا ہے۔ ادھر میں مکان میں داخل ہوئی ادھر اس نے اندر سے کنڈی بند کر لی۔ چاہتی ہوں کہ چیخوں اس نے منہ میں گودڑ ٹھونس دی۔ میرے دونوں ہاتھ رومال سے کس دیے۔ اس مکان کا ایک دروازہ دوسری طرف تھا مجھے زمین پر بٹھا کے آپ گیا وہ دروازہ کھولا اور پیر بخش کہہ کے آواز دی۔ پیر بخش اندر آیا۔ دونوں نے مل کر مجھے بیل گاڑی پر سوار کیا۔ گاڑی چل نکلی۔ میں دم بخود رہ گئی۔ تلے کی سانس تلے اوپر کی اوپر۔ کروں کیا کوئی بس نہیں۔ موڑی کے چنگل میں ہوں۔ دلاور خاں بھلی کے اندر مجھے گھٹنوں دبائے بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں چھری ہے۔ موئے کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ پیر بخش گاڑی ہنک رہا ہے۔ بیل ہیں کہ اڑے چلے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ جاڑے کے دن تھے سنائے کی ہوا چل رہی تھی۔ سردی کے مارے میری بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی دم نکلا جاتا تھا۔

آنکھوں سے باراں جاری تھا۔ دل میں یہ خیال آتا تھا ہائے کس آفت میں پھنسی۔ ابا نوکری پر سے آئے ہوں گے مجھے ڈھونڈتے ہوں گے۔ اماں پیٹ رہی ہوں گی۔ چھوٹا بھائی کھیل رہا ہوگا۔ اسے کیا معلوم بہن کس آفت میں ہے۔ ماں باپ مکان کا دالان انگنائی باورچی خانہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہ سب خیالات ایک طرف تھے اور جان کا خوف ایک طرف۔ دلاور خان گھڑی گھڑی چھری دکھاتا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی دم میں یہ چھری میرے کلیجے کے پار ہوگی۔ گودڑ اب میرے منہ میں نہ تھا مگر مارے ڈر کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ ادھر میرا تو یہ حال تھا ادھر دلاور خاں اور پیر بخش میں ہنس ہنس کر باتیں ہو رہی تھیں۔ میرے ماں باپ پر اور مجھ پر بات بات پر گالیاں پڑتی جاتی تھیں۔

دلاور خان: دیکھا بھائی پیر بخش! سپاہی کے پوت بارہ برس کے بعد اپنا بدلہ

لیتے ہیں۔ اب کیسا..... تلملاتا پھرتا ہوگا۔

پیر بخش: بھئی تم نے بے شک اس مثال کو اصل کر دکھایا۔ بارہ برس تو

ہوئے ہوں گے تمہیں قید ہوئے؟

دلاور خاں: پورے بارہ برس ہوئے بھائی! لکھنؤ میں کیا کیا مصیبتیں اٹھائی

ہیں خیر۔۔۔ وہ اس۔۔۔ کو تو کوئی دن کو یاد کرے گا۔ یہ تو میرا پہلا وار تھا میں تو اس کو جان سے ماروں گا۔

پیر بخش: کیا یہ بھی ارادہ ہے؟

دلاور خاں: تم سمجھتے کیا ہو جان سے نہ مارا ہو تو پٹھان کا تخم نہیں۔

پیر بخش: بھئی تم قول کے سچے ہو جو کہو گے کر دکھاؤ گے۔

دلاور خاں: دیکھنا!

پیر بخش: اور اسے کیا کرو گے؟

دلاور خاں: کریں گے کیا یہیں کہیں مار کے نالے میں توپ دو۔ راتوں

رات گھر چلے چلو۔

یہ بات سن کر مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو تھم گئے دل میں ایک دھچکا سا پہنچا منکا ڈھل گیا ہاتھ پاؤں ڈال دیے۔ یہ حال دیکھ کر بھی موئے کٹر کوترس نہ آیا اور ایک گھونٹہ زور سے میرے کلیجے پر مارا کہ میں بلبلا گئی۔ قریب تھا کہ گر پڑوں۔

پیر بخش: اسے تو مار ڈالو گے اور ہمارا روپیہ؟

دلاور خاں: گلے گلے پانی۔

پیر بخش: کہاں سے دو گے؟ ہم تو کچھ اور ہی سمجھتے تھے۔

دلاور خاں: گھر تو چلو۔ کہیں سے نہ ہو سکے گا تو کبوتر بچ کر دے دوں گا۔

پیر بخش: تم بے عقل ہو۔ کبوتر کیوں بیچو؟ ہم نہ ایک بات بتائیں؟

دلاور خاں: کہو۔

پیر بخش: اماں لکھنؤ میں چل کے اسی چھو کری کے کوڑے کرو۔

جب سے اپنے مرنے کا یقین ہو گیا تھا مجھے ان دونوں موزیوں کی باتیں کانوں سے اچھی طرح سنائی نہ دیتی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی خواب میں باتیں کر رہا ہے۔ پیر بخش کی یہ بات سن کر میرے دل کو پھر اپنی زندگی کا کچھ آسرا بندھا۔ دل ہی دل میں پیر بخش کو دعا میں دینے لگے۔ مگر اب یہ انتظار ہے کہ دیکھوں یہ موزی کیا کہتا ہے۔

دلاور خاں: اچھا دیکھا جائے گا ابھی تو چلے چلو۔

پیر بخش: یہاں ذرا ٹھہر نہ جائیں؟ وہ درخت کے نیچے آگ جل رہی ہے

تھوڑی آگ لے آئیں تو حقہ بھر لیں۔

پیر بخش تو آگ لینے گیا۔ پھر یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں پیر بخش کے آتے آتے یہ میرا کام نہ تمام کر دے۔ جان کا خوف برا ہوتا ہے۔ اک بارگی زور سے چیخ ماری۔ چیخ کا مارنا تھا کہ دلاور خاں نے دو تین طمانچے میرے منہ پر کس کس کے لگائے۔ ”حرام زادی! چپ نہیں رہتی۔ ابھی چھری بھونک دوں گا۔ فیل کرتی ہے۔“

پیر بخش: (ابھی تھوڑی ہی دور گیا ہوگا) نہیں بھئی نہیں۔ ایسا کام نہ کرنا!

تمہیں ہمارے سر کی قسم! اماں ہمیں تو آ لینے دو۔

دلاور خاں: اچھا جاؤ آگ لے آؤ۔

پیر بخش گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آگ لے کے آیا۔ حقہ بھرا دلاور خاں کو دیا۔

دلاور خاں: (ایک کش حقے کا پی کر) تو یہ کتنے تک بک جائے گی؟ اور بیچے گا

کون؟ ایسا نہ ہو کہ کہیں پکڑے جائیں تو اور مشکل ہو۔

پیر بخش: اس کا ہمارا ذمہ۔ ہم تو بیچ دیں گے۔ ارے میاں تمہاری باتیں!

پکڑے گا کون؟ لکھنؤ میں ایسے معاملے دن رات ہوا کرتے

ہیں۔ ہمارے سارے کو جانتے ہو؟

دلاور خاں: کریم؟

پیر بخش: ہاں! اس کی روٹی اسی پر ہے۔ بیسیوں لڑکے لڑکیاں پکڑ لے گیا!

لکھنؤ میں جا کے دام کھرے کر لیے۔

دلاور خاں: آج کل کہاں ہے؟

پیر بخش: کہاں ہے؟ لکھنؤ میں ہوگا۔ گوشتی اس پار اس کی سسرال ہے

وہیں ہوگا۔

دلاور خاں: بھلا لڑکی لڑکا کتنے کو بکتے ہیں؟

پیر بخش: جیسی صورت ہوئی۔

دلاور خاں: بھلا یہ کتنے کو بک جائے گی؟

پیر بخش: سوڈیڑھ سو جیسی تمہاری تقدیر ہوئی۔

دلاور خاں: بھائی کی باتیں! سوڈیڑھ سو! اس کی صورت ہی کیا ہے؟ سو بھی



ملیں تو بہت ہے۔

پیر بخش: اچھا اس سے کیا ہے لے تو چلو مار ڈالنے سے کیا فائدہ؟

اس کے بعد دلاور خاں نے پیر بخش کے کان میں کچھ جھک کے کہا جس کو میں نے نہیں بنا۔ پیر بخش نے جواب دیا: ”وہ تو ہم سمجھے ہی تھے تم کیا ایسے بے وقوف ہو۔“

رات بھر گاڑی چلا کی۔ میری جان سانسے میں تھی۔ موت آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی۔ رقت سلب ہو گئی تھی بدن سن ہو گیا تھا۔ آپ نے سنا ہو گا کہ نیند سولی پر بھی آتی ہے تھوڑی دیر میں آنکھ لگ گئی۔ ترس خدا کر کے پیر بخش نے بیلوں کا کبل اوڑھا دیا۔ رات کو کئی مرتبہ چونک چونک پڑی۔ آنکھ کھل جاتی تھی مگر ڈر کے مارے چپکی پڑی تھی۔ آخر ایک مرتبہ ڈرتے ڈرتے منہ پر سے کبل سرکا کے جو دیکھا معلوم ہوا گاڑی میں اکیلی ہوں۔ پردے سے جھانک کر دیکھا سامنے کچھ کچے مکان ہیں ایک بننے کی دکان ہے۔ دلاور خاں اور پیر بخش کچھ خرید رہے ہیں۔ بیل سامنے برگد کے درخت کے نیچے بھوسا کھا رہے ہیں۔ دو تین گنوار الاؤ کے پاس بیٹھے ہوئے تاپ رہے ہیں۔ ایک چلم پی رہا ہے۔ اتنی دیر میں پیر بخش نے گاڑی کے پاس آ کے تھوڑے سے بھنے ہوئے پننے مجھ کو دیے۔ رات بھر کی بھوک تھی کھانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لوٹا پانی لا کے دیا۔ میں نے تھوڑا سا پیا پھر چپکی ہو کے پڑ رہی۔

بڑی دیر تک گاڑی یہاں ٹھہری رہی۔ پھر پیر بخش نے بیل جوتے دلاور خاں حقہ بھر کے میرے پاس آ بیٹھا گاڑی روانہ ہوئی۔ آج دن کو مجھ پر زیادہ سختی نہیں ہوئی۔ نہ دلاور خاں کی چھری نکلی نہ مجھ پر گھونٹے پڑے نہ گھر کیاں۔ دلاور خاں اور پیر بخش جگہ جگہ پر حقہ بھر بھر کے پیتے تے باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ جب باتیں کرتے کرتے تھک گئے کچھ گانے لگے۔ ایک گاتا ہے دوسرا چپکا سن رہا ہے۔ سن کیا رہا ہے سوچ رہا ہے کہ اب کیا بات نکالوں۔ پھر کوئی بات نکل آئی۔ اس گفتگو میں اکثر ایسا بھی ہوا کہ آپس میں گالی گلوچ ہونے لگی استینیں چڑھ گئیں کمریں کسی جانے لگیں۔ ایک گاڑی سے کود پڑتا ہے دوسرا وہیں گلا گھونٹنے کو تیار ہے۔ پھر کسی بات پر دونوں ڈھیلے پڑ گئے بات رفت گزشت ہوئی ملاپ ہوا دوستی کی باتیں ہونے لگیں۔ گویا کبھی لڑے ہی نہ تھے۔

ایک: ہمارے تمہارے لڑائی ہی کیا بات کی بات تھی۔

دوسرا: بات ہی کیا تھی؟



پہلا: اچھا تو پھر اس بات کو جانے دو۔

دوسرا: جانے دو۔

۲

دے پھڑکنے کی اجازت صیاد

شب اول ہے گرفتاری کی

گرفتاری کی شب اول کا حال تو آپ سن چکے۔ ہائے وہ بے بسی مرتے دم تک نہ بھولوں گی! مجھے خود حیرت ہے کہ میں کیوں کر زندہ بچی۔ ہے ہے کیا سخت جان تھی کہ دم نہ نکلا۔ دلاور خاں بندے! دنیا میں تو خیر تو اپنی سزا کو پہنچا، مگر کیا اس سے میرے دل کی تسکین ہوئی؟ موئے کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کر چیل کوں کو کھلاتی تو بھی مجھے آہ نہ آتی۔ یقین ہے کہ قبر میں تجھ پر صبح شام جہنم کے کندے پڑتے ہوں گے اور قیامت کے دن چاہے گا تو اس سے بدتر درجہ ہوگا۔

ہائے میرے ماں باپ کا کیا حال ہوگا! کیسے تیزی جان کو کلپتے ہوں گے۔ بس مرزا صاحب! اتنی آج کہی باقی کل کہوں گی۔ اب میرا دل ہے کہ امنڈا چلا آتا ہے۔ جی چاہتا ہے خوب چیخیں مار مار کے روؤں.....

آپ میری آوارگی کی سرگزشت سن کے کیا کیجیے گا۔ بہتر ہے کہ یہیں تک رہنے دیجیے۔ میں تو یہ کہتی ہوں کاش دلاور خاں مجھ کو مار ہی ڈالتا تو اچھا تھا۔ مٹھی بھر خاک سے میری آبرو ڈھک جاتی۔ میرے ماں باپ کی عزت کو دھبا نہ لگتا۔ یہ دین و دنیا کی روسیاہی تو نہ ہوتی۔

ہاں میں نے اپنی ماں کو ایک بار پھر دیکھا تھا۔ اس کو بھی ایک زمانہ ہوا۔ اب خدا جانے جیتی ہیں یا مر گئیں۔ سنا ہے کہ چھوٹے بھائی کے ایک لڑکا ہے، ماشاء اللہ چودہ پندرہ برس کا، دو لڑکیاں ہیں۔ میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان سب کو دیکھوں۔ کچھ ایسا دور بھی نہیں۔ موئے ایک روپے میں تو آدمی فیض آباد پہنچ سکتا ہے، مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ اس زمانے میں جب ریل نہ تھی، فیض آباد سے لکھنؤ چار دن کا رستہ تھا، مگر دلاور خاں اس خوف سے کہ کہیں میرا باپ پیچھا نہ کرے، نہ معلوم کن بیڑ راستوں سے لایا کہ کوئی آٹھ دن میں لکھنؤ پہنچی۔ مجھ گاؤڑی کو کیا خبر تھی کہ

لکھنو کہاں ہے، مگر دلا درخاں اور پیر بخش کی باتوں سے میں اتنا سمجھ گئی تھی کہ یہ لوگ مجھے وہیں لیے جاتے ہیں۔ لکھنو کا نام گھر میں سنا کرتی تھی، کیوں کہ میرے نانا یہیں کسی محل کی ڈیوڑھی پر سپاہیوں میں نوکرتھے۔ گھر میں ان کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ فیض آباد بھی گئے تھے۔ میرے لیے بہت سی مٹھائی اور کھلونے لے گئے تھے۔ میں انہیں اچھی طرح پہچانتی تھی۔

لکھنو میں گوشتی اس پار کریم کی سسرال میں مجھے لا کر اتارا۔ چھوٹا سا کچا مکان اور کریم کی ساس موئی مردے شوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے گھر میں لے گئی۔ ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ صبح ہوتے لکھنو پہنچی تھی، دو پہر تک بند رہی۔ پھر کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ ایک جوان سی عورت (کریم کی جورو) تین چپائیاں اور ایک مٹی کے پیالے میں چمچ بھر ماش کی دال اور پانی کی ایک بدھنی میرے آگے رکھ کر چلی گئی۔ مجھے اس وقت وہ بھی نعمت ہو گئی۔ آٹھ دن ہو گئے تھے گھر کا پکا کھانا نصیب نہ ہوا تھا۔ راستے میں چنے اور ستوؤں کے سوا کچھ ملا ہی نہ تھا۔ کوئی آدمی بدھنی بھر پانی پی گئی۔ اس کے بعد زمین پر پاؤں پھیلا کر سو رہی۔ خدا جانے کتنی دیر سوئی کیوں کہ اس اندھیری کوٹھری میں دن رات کی تمیز تو ہو ہی نہ سکتی تھی۔ اس درمیان میں کئی مرتبہ آنکھ کھلی۔ چاروں طرف اندھیرا، کوئی آس نہ پاس، پھر اوڑھنی سے منہ ڈھانپ کر پڑ رہی۔ پھر نیند آ گئی۔ تیسری چوتھی مرتبہ جو آنکھ کھلی تو پھر نیند نہ آئی، پڑی جا گئی رہی۔ اتنے میں کریم کی ساس، ڈائن کی شکل بکتی بڑبڑاتی اندر آئی۔ میں اٹھ گئی۔

”اونڈیا کتنا سوتی ہے۔ رات کو چیختے چیختے گلا پڑ گیا۔ جھنجھوڑ، جھنجھوڑ کے اٹھایا، سانس ہی نہ لی۔ میں تو سمجھی تھی سانپ سونگھ گیا۔ اے لو وہ پھر اٹھ بیٹھی۔“

میں چپکے سنا کی۔ جب خوب بک جھک چکی تو پوچھنے لگی ”پیالہ کہاں ہے؟“ میں نے اٹھا دیا۔ وہ باہر لے کر نکلی۔ کوٹھری کا دروازہ بند ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کریم کی جورو آئی۔ اسی کوٹھری میں ایک کھڑکی لگی تھی، اسے کھول دیا۔ مجھ کو باہر نکالا۔ ایک ٹوٹا سا کھنڈر پڑا تھا۔ یہاں آ کے آسمان دیکھنا نصیب ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اسی کال کوٹھری میں بند کر دی گئی۔ آج ارہر کی دال اور جوار کا دلیہ کھانے کا ملا۔

اسی طرح دو دن گزرے، تیسرے دن ایک لڑکی مجھ سے سن میں دو ایک برس بڑی، اسی کوٹھری میں لا کے بند کی گئی۔ کریم خدا جانے کہاں سے پھسلا کے لے آیا تھا۔ بے چاری کیسی چہکو پہکو روتی رہتی۔ مجھ کو اس کا آنا غصیت ہو گا۔ جب وہ رو دھو چکی تو چپکے چپکے باتیں ہوا کیں۔ کسی

بچے کی لڑکی تھی، رام دئی نام تھا۔ سیتاپور کے پاس کوئی گاؤں تھا وہاں کی رہنے والی تھی۔ اندھیرے میں تو اس کی شکل دکھائی نہ دی۔ جب حسب معمول دوسرے دن کھڑکی کھولی گئی تو اس نے مجھ کو دیکھا، میں نے اس کو دیکھا۔ گوری گوری، بہت خوب صورت ناک، نقشہ ڈیل ذرا چھریا تھا۔

چوتھے دن اس کال کوٹھری سے اس کی رہائی ہوئی۔ میں وہیں رہی۔ پھر تنہائی نصیب ہوئی۔ دو دن اکیلی وہیں رہی۔ تیسرے دن رات کے وقت دلاور خان اور پیر بخش نے آ کے مجھے نکالا، اپنے ساتھ لے کے چلے۔ چاندنی رات تھی۔ پہلے ایک میدان سا ملا، پھر ایک بازار میں سے ہو کے گزرے۔ پھر ایک پل پر آئے۔ دریا لہریں مار رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں کانپتی جاتی تھی۔ تھوڑی دور کے بعد ایک بازار پھر ملا، اس سے نکل کے ایک تنگ گلی میں بہت دور تک چلنا پڑا، پاؤں تھک گئے۔ اس کے بعد ایک اور بازار میں آئے۔ یہاں بڑی بھینٹ تھی۔ راستہ مشکل سے ملتا تھا۔ اب ایک مکان کے دروازے پر پہنچے۔

مرزا رسوا صاحب! آپ سمجھئے یہ کون سا بازار تھا؟ یہ وہ بازار تھا جہاں میری عزت فروشی کی دکان تھی، یعنی چوک، اور یہ وہ مکان تھا جہاں سے ذلت، عزت، بدنامی، نیک نامی، زرد روئی، سرخ روئی، جو کچھ دنیا میں ملتا تھا ملا، یعنی خانم جان کا مکان، دروازہ کھلا ہوا تھا۔ تھوڑی دور پر زینہ تھا۔ زینے پر سے چڑھ کر اوپر گئی۔ مکان کے صحن میں سے ہو کے صدر دالان کے داہنی طرف ایک وسیع کمرے میں خانم جان کے پاس گئی۔

خانم جان کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس زمانے میں ان کا سن قریب پچاس برس کے تھا۔ کیا شان دار بڑھیا تھی! رنگ تو سانولا تھا، مگر ایسی بھاری بھر کم جامہ زیب عورت دیکھی نہ سنی۔ بالوں کے آگے کی لٹیں بالکل سفید تھیں، مگر ان کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ ململ کا سفید دوپٹا کیسا باریک چٹا ہوا کہ شاید و باید۔ اودے شروع کا پائے جامہ بڑے بڑے پائینچے۔ ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے کلائیوں میں پھنسے ہوئے، کانوں میں سادی دو دو انتیاں لاکھ لاکھ بناؤ دیتی تھیں۔ بسم اللہ کی رنگت، ناک نقشہ ہو بہو انہی کا سا تھا، مگر وہ نمک کہاں۔ اس دن کی صورت خانم کی مجھے آج تک یاد ہے۔ پلنگزی سے لگی ہوئی قالین پر بیٹھی ہیں، کنول روشن ہے۔ بڑا سانس کی پان دان آگے کھلا ہوا رکھا ہے۔ پیچوان پی رہی ہیں۔ سامنے ایک سانولی سی لڑکی بسم اللہ جان ناچ رہی ہے۔ ہمارے جانے کے بعد ناچ موقوف ہوا۔ سب لوگ کمرے سے چلے گئے۔ معاملہ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔



خانم جان: یہی چھو کری ہے؟

دلاور خان: جی ہاں!

مجھے پاس بلایا، چکار کے بٹھایا، ماتھا اٹھا کے صورت دیکھی۔

خانم جان: اچھا! پھر جو ہم نے کہہ دیا ہے وہ موجود ہے اور دوسری چھو کری کیا ہوئی؟

پیر بخش: اس کا تو معاملہ ہو گیا۔

خانم جان: کتنے پر؟

پیر بخش: دو سو پر۔

خانم جان: اچھا خیر، کہا لیا ہوا؟

پیر بخش: ایک بیگم صاحبہ نے اپنے صاحب زادے کے واسطے مول لیا۔

خانم جان: صورت شکل کی اچھی ہے اس قدر ہم بھی دے نکلتے، مگر تم نے جلدی کی۔

پیر بخش: میں کیا کروں، میں نے بہت سمجھایا، میرے سالے نے نہ مانا۔

دلاور خان: صورت تو اس کی بھی اچھی ہے آگے آپ کی پسند۔

خانم جان: خیر آدمی کا بچہ ہے۔

دلاور خان: اچھا، جو کچھ ہے آپ کے سامنے ہے۔

خانم جان: اچھا، تمہاری ہی ضد سی۔

یہ کہہ کر حسینی کو آواز دی۔ حسینی گدبدی سی سانولی ادھیڑ عورت سامنے آ کھڑی ہوئی۔

خانم جان: حسینی!

حسینی: خانم صاحب!

خانم جان: صندوقچہ لاؤ۔

حسینی گئی، صندوقچہ لے آئی۔ خانم صاحب نے صندوقچہ کھولا۔ بہت سے روپے دلاور خان کے سامنے رکھ دیے (بعد ازاں معلوم ہوا کہ سوا سو روپے تھے۔) ان میں سے کچھ روپے پیر بخش نے گن کے اپنے رومال میں باندھے۔ (سنا ہے کہ پچاس روپے) باقی دلاور خان مردو پے نے اپنے ڈب میں رکھے۔ دونوں سلام کر کے رخصت ہوئے اب کمرے میں خانم صاحب ہیں، بوا



حسینی ہیں اور میں ہوں۔

خانم جان: (حسینی سے) حسینی! یہ چھو کری اتنے داموں کچھ مہنگی تو نہیں معلوم ہوتی؟

حسینی: مہنگی! میں کہتی ہوں سستی۔

خانم جان: سستی بھی نہیں ہے خیر ہوگا۔ صورت تو بھولی بھالی ہے۔ خدا جانے کس کی لڑکی ہے۔ ہائے ماں باپ کا کیا حال ہوا ہوگا۔ خدا جانے کہاں سے موئے پکڑ لاتے ہیں۔ ذرا بھی خوف خدا نہیں۔ بوا حسینی! ہم لوگ بالکل بے قصور ہیں۔ عذاب ثواب انہی موؤں کی گردن پر ہوتا ہے۔ ہم سے کیا! آخر یہاں نہ بکتی کہیں اور بکتی۔

حسینی: خانم صاحب! یہاں پھر اچھی رہے گی۔ آپ نے سنا نہیں! بیویوں میں لونڈیوں کی کیا گتیں ہوتی ہیں؟

خانم جان: سنا کیوں نہیں۔ اے ابھی اس دن کا ذکر ہے سنا تھا سلطان جہاں بیگم نے اپنی لونڈی کو کہیں میاں سے بات کرتے دیکھ لیا تھا، سینچوں سے داغ داغ کے مار ڈالا۔

حسینی: دنیا میں جو چاہیں کر ڈالیں قیامت کے دن ایسی بیویوں کا منہ کالا ہوگا۔

خانم جان: منہ کالا ہوگا! جہنم کے کندھے پڑیں گے۔

حسینی: خوب ہوگا، مویوں کی یہی سزا ہے۔

اس کے بعد بوا حسینی نے بڑی منت سے کہا۔

”بیوی یہ چھو کری تو مجھے دے دیجیے۔ میں پاؤں گی۔ مال آپ کا ہے خدمت میں کروں گی۔“

خانم جان: تمھی پاؤ۔

اب تک بوا حسینی کھڑی ہوئی تمھیں اس غنفلو کے بعد میرے پاس بیٹھ گئیں مجھ سے باتیں کرنے لگیں۔

حسینی: بچی! تو کہاں سے آئی ہے؟

میں: (روکے) بنگلے سے۔

حسینی: (خانم سے) بنگلہ کہاں ہے؟

خانم جان: اے ہے کیا منھی ہو؟ فیض آباد کو بنگلہ بھی کہتے ہیں۔

حسینی: (مجھ سے) تمہارے ابا کا کیا نام ہے؟

میں: جمعدار۔

خانم جان: تم بھی غضب کرتی ہو۔ بھلا وہ نام کیا جانے ابھی بچہ ہے۔

حسینی: اچھا تمہارا نام کیا ہے؟

میں: امیرن۔

خانم جان: بھئی یہ نام تو ہمیں پسند نہیں، ہم تو امر او کہہ کر پکاریں گے۔

حسینی: سنا بچی! امر او کے نام پر تم بولنا۔ جب بیوی کہیں گی ”امراؤ“ تم

کہنا ”جی“

اس دن سے میرا نام امر او ہوگا۔ تھوڑے دنوں کے بعد جب میں رنڈیوں کے شمار میں آئی لوگ امر او جان کہنے لگے۔ خانم صاحب مرتے دم تک ”امراؤ“ کہا کیں۔ بوا حسینی ”امراؤ صاحب“ کہتی تھیں۔ اس کے بعد بوا حسینی اپنی کوٹھری میں لے گئیں۔ اچھا اچھا کھانا کھلایا، مٹھائیاں کھلائیں۔ منہ ہاتھ دھلایا، اپنے پاس سلا رکھا۔

آج رات کو میں نے ماں باپ کو خواب میں دیکھا۔ جیسے ابا نوکری پر سے آئے ہیں، مٹھائی کا دو نا ہاتھ میں ہے، چھوٹا بھائی سامنے کھیل رہا ہے، اس کو مٹھائی کی ڈلیاں نکال کر دیں۔ مجھے پوچھ رہے ہیں، جیسے میں دالان میں ہوں، اماں باورچی خانے میں ہیں اتنے میں جو ابا کو دیکھا، دوڑ کے لپٹ گئی۔ رورو کے اپنا حال کہہ رہی ہوں۔ خواب میں اتاروئی کہ چکیاں بندھ گئیں۔ بوا حسینی نے ہشیار کیا۔ آنکھ جو کھلی تو کیا دیکھتی ہوں، نہ وہ گھر ہے، نہ دالان، ابا ہیں، نہ اماں، بوا حسینی کی گود میں پڑی رورہی ہوں۔ بوا حسینی آنسو پونچھ رہی ہیں۔ چراغ روشن تھا، میں نے دیکھا کہ بوا حسینی کے بھی آنسو برابر جاری ہیں۔

واقعی بوا حسینی بڑی نیک ذات عورت تھی۔ اس نے مجھ پر وہ شفقت کی کہ چند ہی روز میں میں اپنے ماں باپ کو بھول گئی اور بھولتی نہ تو کرتی کیا! اول تو مجبوری، دوسرے نئے ڈھنگ، نئے

رنگ اچھا سے اچھا کھانے کو کھانے وہ جن کے ذائقے سے بھی میں آگاہ نہ تھی۔ کپڑے وہ جو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ تین لڑکیاں بسم اللہ جان، خورشید جان، امیر جان ساتھ کھیلنے کو۔ دن رات ناچ گانا، جلسے، تماشے، میلے، باغوں کی سیر، وہ کون سا ایسا عیش کا سامان تھا جو مہیا نہ تھا۔ مرزا صاحب! آپ کہیں گے کہ میں بڑے کٹر دل کی تھی کہ بہت ہی جلد اپنے ماں باپ کو بھول کر کھیل کود میں پڑ گئی۔ اگرچہ میرا سن بہت کم تھا، مگر خانم کے مکان میں آنے کے ساتھ ہی میرے دل کو آگاہی سی ہو گئی کہ اب مجھے عمر بھر یہیں تیر کرنا ہے۔

جیسے نئی دلہن اپنی سسرال جا کے سمجھ لیتی ہے کہ میں یہاں ایک دو دن کے لیے نہیں، بلکہ مرنے اور بھرنے کے لیے آئی ہوں، ٹھیک وہی میرا حال تھا۔ راستے میں ان موئے ڈکیٹوں کے ہاتھ سے وہ ایذا اٹھائی تھی کہ خانم کا مکان میرے لیے بہشت تھا۔ ماں باپ کے ملنے کو میں بالکل ناممکن سمجھ چکی تھی اور جو چیز ناممکن سمجھ لی جاتی ہے اس کی آرزو باقی نہیں رہتی۔ اگرچہ فیض آباد لکھنؤ سے صرف ۴۰ کوس ہے، مگر اس زمانے میں مجھے بے انتہا دور معلوم ہوتا تھا۔ بچپن کی سمجھ میں اور اب میں بڑا فرق ہے۔

۳

اک حال میں انسان کی بسر ہو نہیں سکتی

اب رنگ طبیعت کا بدل جائے تو اچھا

مرزا رسوا صاحب! خانم کا مکان تو آپ کو یاد ہوگا، کس قدر وسیع تھا، کتنے کمرے تھے۔ ان سب میں رنڈیاں (خانم کی نوچیاں) رہتی تھیں۔ بسم اللہ (خانم کی لڑکی) اور خورشید میری ہم سنیں تھیں۔ ان کی ابھی رنڈیوں میں کتنی نہ تھی۔ ان کے علاوہ دس گیارہ ایسی تھیں جو الگ الگ کمروں میں رہتی تھیں۔ ہر ایک کا عملہ جدا تھا، ہر ایک کا دربار علیحدہ ہوتا تھا۔ ایک سے ایک خوب صورت تھی۔ سب گہنے پاتے سے آراستہ ہر وقت بنی ٹھنی، تولواں جوڑے پہنے۔ سادے کپڑے جو ہم لوگ روزمرہ پہنے رہتے تھے وہ اور رنڈیوں کو عید بقرعید میں نصیب نہیں ہوتے۔ خانم کا مکان کیا تھا، ایک پرستان تھا۔ جس کمرے میں جالکا، سوائے ایسی مذاق گانے بجانے کے کوئی اور چرچا نہ تھا۔

اگرچہ میں کم سن تھی، مگر پھر بھی عورت ذات بڑی ہوشیار ہوتی ہے، اپنے مطلب کی سب سمجھتی تھی۔  
 بسم اللہ اور خورشید کو گاتے ناچتے دیکھ کر میرے دل میں خود بہ خود ایک امنگ سی پیدا ہوئی۔  
 بجائے خود گنگنا نے اور تھرکنے لگی۔ اسی عرصے میں میری تعلیم بھی شروع ہو گئی۔ میری طبیعت فن  
 موسیقی کے بہت ہی مناسب پائی گئی۔ آواز بھی کچے گانے کے لائق تھی۔ سرگم صاف ہونے کے  
 بعد استاد نے استائی شروع کرادی۔ استاد جی بہت اصول سے تعلیم دیتے تھے۔ ہر ایک زاگ کا سر  
 بیورہ زبانی یاد کرایا جاتا تھا اور وہی گلے سے نکلاتے تھے۔ مجال نہ تھی کوئی سر کوئل سے است کوئل سدھ  
 سے اسدھ یا تیور سے تیور تر ہو جائے۔ اور میری بھی جھتیں کرنے کی عادت تھی۔ پہلے تو استاد جی  
 (خدا کرے ان کی روح شرمندہ ہونہ ہو) ٹال دیا کرتے تھے۔ ایک دن خانم صاحب کے سامنے  
 میں رام کلی گارہی تھی دھیوت سدھ لگا گئی۔ استاد جی نے نہ ٹوکا۔ خانم صاحب نے پھر اسی کو کہوایا۔  
 میں نے پھر اسی طرح کہا۔ استاد جی پھر باخبر نہ ہوئے۔ خانم صاحب نے میری طرف گھور کے  
 دیکھا۔ میں استاد جی کا منہ دیکھنے لگی۔ انہوں نے سر جھکا لیا۔ پھر تو خانم نے ان کو آڑے ہاتھوں  
 لیا۔

خانم: بھلا استاد جی یہ کیا تھا؟ رام کلی میں اوچار دھیوت سے ہے اور  
 وہی سر ٹھیک نہیں۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں دھیوت کوئل ہے

یا سدھ؟

کوئل

استاد:

اور چھو کری نے کیا کہا تھا؟

خانم:

سدھ۔

استاد:

پھر آپ نے ٹوکا کیوں نہیں؟

خانم:

کچھ مجھے خیال نہ رہا۔

استاد:

واہ۔ خیال کیوں نہیں رہا۔ اسی لیے میں نے دوبارہ کہوایا۔

خانم:

پھر بھی آپ منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھے رہے۔ آپ اسی

طرح چھو کریوں کو تعلیم دیتے ہیں؟ ابھی کسی سمجھ دار کے سامنے

اس طرح گاتی تو کیا وہ میرے جنم میں تھوکتا۔

استاد جی اس وقت تو بہت ہی خفیف ہوئے، چپ ہو رہے، مگر دل میں بات لیے رہے۔



استاد جی اپنے کونائک سمجھتے تھے اور تجھے بھی ایسے ہی۔ اس دن خانم کاٹو کتنا ان کو بہت ناگوار ہوا۔  
ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں سوہا گارہی ہوں، خانم بھی موجود ہیں۔ میں نے استاد جی سے  
پوچھا ”گندھارا اس میں کوئل ہے یا ات کوئل؟“  
استاد جی: ات کوئل۔

خانم: خان صاحب! ماشاء اللہ! یہ میرے سامنے!

استاد جی: کیوں؟

خانم: اور پھر آپ مجھی سے پوچھتے ہیں ”کیوں؟“ سوہا میں گندھارا

ات کوئل ہے؟ بھلا آپ تو کہیے۔

استاد جی: گندھارا کوئل کو ات کوئل لگا گئے۔

خانم: بس آپ ہی قائل ہو جیے۔ خود آپ ’کوئل‘ کہیں اور چھو کری کو

’ات کوئل‘۔ یا تو آپ چھو کری کو بہکاتے ہیں یا مجھے کہتے ہیں۔

خان صاحب! میں کچھ عطائی نہیں۔ خاک چاٹ کے کہتی ہوں

گلے سے چاہے نہ ادا ہو، مگر ان کانوں نے کیا نہیں سنا؟ میں بھی

ایسے ویسے گھرانے کی شاگرد نہیں ہوں۔ میاں غلام رسول کو

آپ جانتے ہوں گے۔ ان باتوں سے کیا فائدہ۔ اگر بتانا ہو تو

دل سے بتائیے، نہیں تو معاف کیجیے۔ میں کوئی اور بندوبست کر

لوں گی۔ چھو کریوں کو غارت نہ کیجیے۔

استاد جی: بہت خوب!

یہ کہہ کر اٹھ گئے۔ کئی دن نہیں آئے۔ خانم خود تعلیم دینے لگیں۔ چند روز کے بعد خلیفہ جی بیچ

میں پڑے، قسما قسما ہو کے ملاپ ہو گیا۔ اس دن سے استاد جی ٹھیک ٹھیک بتانے لگے۔ بتاتے نہ تو

کرتے کیا۔ وہ خانم کو اتنا نہ سمجھتے تھے۔ مجھے عمر بھر حیرت رہی کہ خانم زیادہ جانتی ہیں یا استاد جی

کیوں کہ بہت سی باتیں جو خانم سے معلوم ہوئیں، استاد جی ان کو نہ بتا سکتے تھے یا جان بوجھ کے نہ

بتاتے تھے۔ لاکھ قسما قسما ہو چکی تھی، مگر پھر بھی یہ لوگ گر کی باتیں نہیں بتاتے۔ مجھے کچھ ایسا شوق ہو

گیا تھا کہ جہاں کسی بات میں شک ہوایا میں سمجھتی کہ استاد جی ٹالتے ہیں، استاد جی کے جانے کے

بعد خانم صاحب سے پوچھ لیتی تھی۔ وہ بھی میرے اس شوق سے بہت خوش ہوتی تھیں۔ بسم اللہ کو

لعنتیاں دیا کرتی تھیں۔ بسم اللہ پر بہت محنت ہوئی، مگر پہ ٹھہری کے سوا کچھ نہ آیا، اس پر بھی لے سے ہانوں رہیں۔ خورشید کی آواز اچھی نہ تھی۔ صورت پری کی، گلا ایسا جیسے پھٹا بانس۔ ہاں ناچنے میں اچھی تھی اور یہی اس نے سیکھا بھی تھا۔ ان کا بحر صرف ناچ کا ہوتا تھا۔ یوں گانے کو ایک آدھ چیز سیدھی سادی گا بھی دیتی تھیں کہ گانے کا نام ہو جائے۔

خانم کی نوچیوں میں بیگا جان گانے میں فرو تھیں، مگر صورت وہ کہ رات کو دیکھو تو ڈر جاؤ۔ سیاہ جیسے الٹا تو اس پر چپک کے داغ، پاؤ بھر قیمہ بھر دو تو سما جائے۔ لال لال آنکھیں، بھدی ناک بیچ میں سے پچھنی ہوئی۔ موٹے موٹے ہونٹ، بڑے بڑے دانت، فربہ انتہا سے زیادہ اس پر ٹھنگنا قد، بونی ہتھنی کی لوگ پھبتی کتے تھے۔ مگر قیامت کا گلا تھا۔ معلومات بہت اچھی تھیں۔ مور چھنا ان ہی کے گلے سے نکلتے سنا۔ میں جب ان کے کمرے میں جا نکلتی، مارے فرمائشوں کے وق کر دیتی تھی۔

میں: باجی! ہاں ذرا سرگم تو کہنا۔

بیگا: سنو، سنا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔

میں: میں یہ نہیں مانتی، سر تیاں الگ الگ کر کے بتاؤ۔

بیگا: لڑکی! تو بہت ستاتی ہے۔ اپنے استاد جی سے کیوں نہیں پوچھتی؟

میں: اللہ! باجی تم ہی بتاؤ۔

بیگا: سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی دیکھ بائیس ہوئیں؟

میں: (شرارت سے) اوئی، میں نے نہیں گنیں، پھر کہو۔

بیگا: جاب نہیں کہتی۔

میں: واہ! میں تو کہوا کر چھوڑوں گی۔

بیگا: پھر وہی! کہہ دیا، لے اب نہ ستا۔

میں: ہاں اب کی گنیں، 'نی' میں دو ہیں نا؟

بیگا: ہاں دو۔

میں: تو ٹھیک بائیس ہوئیں۔ اب تینوں گرام کہہ دو۔

بیگا: لے اب جھلیے، کل آئے گا۔

میں: اچھا تنبورہ اٹھالاؤں، کچھ گاؤ۔

بیگا: کیا گاؤں؟

میں: دھنا ساری۔

بیگا: کیا گاؤں؟ استائی دھر پڈ ترانہ؟

میں: اللہ! باجی دھر پڈ گاؤ۔

بیگا: لے سن۔

تن کی تپ تپ ہی مٹے جب پیارے کو درشت بھر دیکھوں گی

جب درشن پاؤں گی ان کا تب ہی جی جنم اپنا لیکھوں گی!

اشٹ جام دھیان موہے دا کورہت ہے رہے نا جانوں کب درشن تھیوں گی

جو کو ہو پر بھو پیارے سے ملا دے وا کے پائن میں سیس ٹیکوں گی

خانم جان کی نوچیوں کو صرف ناچ گانے کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی بلکہ لکھنے پڑھنے کے لیے

مکتب بھی تھا۔ مولوی صاحب نوکرتھے۔ حسب دستور میں بھی مکتب میں بھیجی گئی۔ مولوی صاحب کا

نورانی چہرہ سفید کتراں داڑھی صوفیانہ لباس ہاتھ میں عمدہ عمدہ فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں

خاک پاک کی تسبیح اس میں سجدہ گاہ بندھی ہوئی ہر دقت کی جریب چاندی کی شام بہت ہی نفیس

ڈیڑھ ختمہ حقہ فیون کی ڈپیا پیالی غرضیکہ جملہ تبرکات آج تک نظر میں ہیں۔ کیا ستھرا مذاق تھا! واضح

دار بھی ایسے کہ کسی زمانے میں بوا حسینی سے حسب اتفاق کچھ رسم ہو گیا تھا آج تک اسے نباہے

جاتے تھے۔ بوا حسینی بھی انہیں دین و دنیا کا شوہر سمجھتی تھیں۔ بڑھیا بڈھے میں اس مزے کی باتیں

ہوتی تھیں کہ جوانوں کو حوصلہ ہوتا تھا۔ مکان کہیں زید پور کی طرف تھا۔ گھر پر خدا کے دیے گاؤں

گراؤں مکان بیوی جوان لڑکے لڑکیاں سب کچھ موجود تھا مگر خوب جب لکھنؤ میں تحصیل علم کے

لیے تشریف لائے یہیں کے ہو رہے۔ شاید دو چار مرتبہ گئے ہوں گے۔ اکثر عزیز ملنے کو یہیں چلے

آتے تھے۔ گھر سے کبھی کبھی کچھ روپیہ بھی آیا کرتا تھا۔ دس روپے خانم صاحب دیتی تھیں۔ یہ سب

بوا حسینی کو ملتا تھا۔ کھانے پینے حقہ فیون کی تاک بوا حسینی لیتی تھیں۔ تحویل دار بھی بوا حسینی تھیں۔

کپڑا بوا حسینی بنوادیتی تھیں۔ خانم صاحب بھی مولوی صاحب کو بہت مانتی تھیں بلکہ مولوی صاحب

کی وجہ سے بوا حسینی کی عزت کرتی تھیں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ میری پرورش بوا حسینی نے اپنے ذمے لی تھی اس لیے مجھ پر مولوی



صاحب کی توجہ خاص تھی۔ یہ تو میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی کہ مجھے کیا سمجھتے تھے پاس ادب مانع ہے۔ اور لڑکیوں سے زیادہ مجھ پر تاکید تھی۔ مجھ ایسی کندہ نا تراش کو انہوں نے آدی بنادیا۔ یہ ان ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ جس امیر رئیس کی محفل میں گئی، حیثیت سے زیادہ میری عزت ہوئی۔ ان ہی کی بدولت آپ ایسے لائق فائق صاحبوں کے جلسے میں منہ کھولنے کی جرات ہوئی، شاہی درباروں میں شرکت کا فخر حاصل ہوا، اعلیٰ درجے کی بیگمات کے محل میں گزر ہوا۔

مولوی صاحب نے بہت ہی شفقت سے مجھے پڑھایا تھا۔ الف بے ختم ہونے کے بعد کریم، ماسقیم، محمود نامہ صرف رواں پڑھا کے آمد نامہ یاد کرا دیا۔ اس کے بعد گلستاں شروع کرا دی۔ دو سطریں پڑھاتے تھے۔ سبق حفظ کرایا جاتا تھا، خصوصاً اشعار، لفظ لفظ کے معنی، فقرے فقرے کی ترکیب نوک زبان تھی۔ لکھنے پڑھنے پر بھی محنت کی۔ املا درست کرایا گیا، خط لکھوائے گئے۔ گلستان کے بعد اور کتابیں فارسی کی پانی ہو گئی تھیں۔ سبق اس طرح ہوتا تھا جیسے آموختہ پڑھا جاتا ہے۔ عربی کی صرف نحو اور دو ایک رسالے منطق کے پڑھے۔ سات آٹھ برس مولوی صاحب کے پاس پڑھتی رہی۔ شاعری کے شوق کی ابتدا اور انتہا سے آپ خود واقف ہیں، بیان کی کوئی ضرورت نہیں۔

۴

ہم نہیں ان میں جو پڑھ لیتے ہیں طوطے کی طرح

مکتب عشق و وفا تجربہ آموز بھی تھا

مکتب میں مجھ سمیت تین لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا تھا گوہر مرزا۔ حد کا شریر اور بد ذات، سب لڑکیوں کو چھیڑا کرتا تھا۔ کسی کو منہ چڑھا دیا، کسی کے چنگی لے لی، اس کی چوٹی پکڑ کے کھینچ لی، اس کے کان دکھا دیے۔ دو لڑکیوں کی چوٹی ایک میں جکڑ دی۔ کہیں قلم کی نوک توڑ ڈالی، کہیں کتاب پر دوات الٹ دی۔ غرض اس کے مارے ناک میں دم تھا۔ لڑکیاں بھی خوب دھپیاتی تھیں اور مولوی صاحب بھی قرار واقعی سزا دیتے تھے، مگر وہ اپنی آنی بانی سے نہ چوکتا تھا۔ سب سے بڑھ کر میری گت بناتا تھا، کیوں کہ میں سب سے انیلی اور گیگلی سی تھی اور مولوی صاحب کے دباؤ



میں بھی رہتی تھی۔ میں نے بھی مولوی صاحب سے کہہ کہہ کر اکثر مار پٹوائی، مگر بے غیرت کسی طرح باز نہ آیا۔ آخر میں ہی چغلیاں کھاتے کھاتے عاجز آ گئی۔ میری فریاد پر مولوی صاحب اس کو اس بے دردی سے سزا دیتے تھے کہ خود مجھے ترس آ جاتا تھا۔

گوہر مرزا کے اس مکتب میں آنے کا سبب بھی بوا حسینی تھی۔ نواب سلطان علی خان ایک بڑے عالی خاندان رئیس تھے۔ توپ دوازے میں رہتے تھے۔ ان سے اور بنو ڈومنی سے رسم تھا۔ انہی سے ہی لڑکا پیدا ہوا۔ اگرچہ بنو سے اور نواب صاحب سے اب ترک ملاقات ہوئے مدت گزر گئی تھی، مگر دس روپے ماہ بہ ماہ لڑکے کی پرورش کے لیے دیے جاتے تھے اور بیگم صاحبہ سے چوری چھپے کبھی کبھی بلا کے دیکھ بھی لیا کرتے تھے۔ بنو قاضی کے باغ کی رہنے والی تھیں وہیں بوا حسینی کے بھائی کا گھر تھا۔ کھڑکی درمیان میں تھی۔ گوہر مرزا بچپن ہی سے ذات شریف تھے۔ تمام محلے کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کسی کے گھر میں ڈھیلا پھینک دیا، کسی کی کنکیا چھین لی، کسی کی مرغی کی ٹانگیں توڑ دیں، کسی لڑکے سے چڑکوؤں کا پنجرہ دیکھنے کا مانگا، اس نے دے دیا، آپ نے کھڑکی کی تیلی کھول دی، سب چڑکوے پھر سے اڑ گئے۔ غرض کہ طرح طرح کے آزار دیتے تھے۔ آخر ماں نے عاجز ہو کر محلے کی مسجد میں ایک مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا۔ اس کی ٹوپی پھاڑ ڈالی، ایک لڑکے کی جوتی کنوئیں میں ڈال دی۔ ایک دن مولوی صاحب نماز پڑھ رہے تھے، حضرت نے ان کا نیا چڑھواں جوتا حوض میں تیرا دیا، خود بیٹھے ہوئے سیر دیکھ رہے ہیں۔ اتنے میں کہیں سے مولوی صاحب سر پر پہنچ گئے۔ اب تو گوہر مرزا کی خوب ہی مرمت ہوئی۔ مولوی صاحب نے مارے طمانچوں کے منہ لال کر دیا، اور کان پکڑے ہوئے بنو کے گھر پر لے آئے۔ دروازے پر سے پکار کے کہا ”لو صاحب اپنا لڑکا، ہم اسے نہ پڑھائیں گے“ یہ کہہ کر مولوی صاحب تو ادھر گئے، گوہر مرزا مظلوم صورت بنائے روتا ہوا گھر میں آیا۔ اس وقت اتفاق سے بوا حسینی بنو سے بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔ لڑکے کا جو یہ حال دیکھا، آپ کو بہت ہی ترس آیا۔ لڑکے کے کرتوتوں سے تو آگاہ تھیں نہیں، مولوی صاحب کو برا بھلا کہنے لگیں۔

بوا حسینی: اے ہے مولوی کا ہے کو، موافقتی ہے۔ لڑکے کا منہ مارے

طمانچوں کے سجا دیا۔ اے لو، کان بھی تو لہو لہان کر دیئے۔ نابی

بی، ایسے مولوی سے کوئی نوج پڑھوائے۔ آخر ہمارے مولوی

صاحب بھی تو پڑھاتے ہیں۔ کیسا چکار کے دلار کے پڑھاتے

ہیں۔

بنو نے چھوٹے ہی کہا ”پھر بوا حسینی اس کو بلا سے اپنے مولوی صاحب ہی کے

پاس لے جاؤ۔“

بوا حسینی: لے تو جاؤں مگر بہت دور ہے۔

بنو: تمہارے بھائی کے ساتھ صبح کو بھجوا دیا کروں گی، شام کو بلوایا

کروں گی۔

بوا حسینی: اچھا تو بھجوا دیا کرو۔

مولوی صاحب سے کچھ پوچھنا تھا اس لیے کہ بوا حسینی کو اپنے حسن خدمت پر پورا بھروسہ تھا۔ جانتی تھیں کہ مولوی صاحب انکار تو کریں گے نہیں۔

دوسرے دن علی بخش (بوا حسینی کے بھائی کا نام تھا) گوہر مرزا کو ساتھ لیے مٹھائی کا خوان سر پر رکھے بوا حسینی کے پاس پہنچے۔ بوا حسینی نے خوشی خوشی مٹھائی تقسیم کی، لڑکے کو مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا۔

گوہر مرزا سب سے زیادہ مجھی کو ستاتا تھا۔ دن رات داد بے داد کا غل رہتا تھا۔ مولوی صاحب نے اس کو بہت بہت مارا، مگر اس نے مجھے ستانا نہ چھوڑا، اسی طرح کئی برس گزر گئے۔ آخر میری اس کی صلح ہو گئی، یا یوں کہیے کہ میں اس کے ستانے کی خوگر ہو گئی۔

گوہر مرزا کے اور میرے سن میں کچھ ہی فرق ہو گا۔ شاید وہ مجھ سے دو ایک سال بڑا ہو۔ جس زمانے کا حال لکھ رہی ہوں، میرا سن کوئی تیرہ برس ہو گا اور گوہر مرزا کو چودھواں پندرھواں سال تھا۔

گوہر مرزا کے ستانے سے اب مجھ کو مرزا آنے لگا تھا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی (ڈومنی کا لڑکا تھا) قدرتی لے دار۔ بتانے میں مشاق، بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی۔ ادھر میں لے سر سے آگاہ۔ جب مولوی صاحب مکتب میں نہ ہوتے تھے خوب جلسہ ہوتا تھا۔ میں گانے لگی وہ بتانے لگا۔ کبھی وہ گارہا ہے، میں تال دے رہی ہوں۔ گوہر مرزا کی آواز پر اور رنڈیاں بھی فریفتہ تھیں۔ ہر ایک کمرے میں بلایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ میرا جانا بھی ایک ضروری بات تھی، کیونکہ بغیر میری اس کی سنگت کے لطف نہ آتا تھا۔ سب سے زیادہ امیر جان اس کے گانے پر غش تھیں۔

مرزا صاحب! آپ کو امیر جان یاد تو ہوں گی؟

رسوا: یاد ہیں، کہے جاؤ۔

امیر جان کا وہ زمانہ جب وہ مفتخر الدولہ بہادر کی ملازمہ تھیں، اللہ رے جو بن کے ٹھاٹھ! وہ اٹھتی ہوئی جوانی!

کھلتی کھلتی وہ چمپئی رنگت

بھولی بھالی وہ موہنی صورت

بانگی بانگی ادا میں ہوش ربا

ترچھی ترچھی نگاہیں تھر خدا

بوٹا سا قد، چھریرا بدن، نازک نازک ہاتھ پاؤں!

رسوا: اب تو میں نے جب ان کو دیکھا ہے، لگتی پر ڈالنے کے لائق تھیں۔ ایسی بری صورت ہو گئی تھی کہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔

امراؤ: کہاں دیکھا تھا؟

رسوا: انہی کے گھر میں دیکھا تھا جن کے کمرے کے سامنے ایک شاہ

صاحب گیر دے کپڑے پہنے، ہزار دانے کی تسبیح ہاتھ میں لیے

کھڑے رہتے تھے۔ ادھر سے جو نکلتا اس کو سلام کر لیتے تھے

کبھی کسی سے سوال نہیں کرتے تھے۔

امراؤ: سمجھ گئی! وہ شاہ صاحب ان کے عاشقوں میں تھے۔

رسوا: جی ہاں، کیا میں نہیں جانتا!

امراؤ: اچھا تو اب وہیں رہتی ہیں؟

رسوا: انکی مصاحبت میں ہیں۔

امراؤ: اور ان کا حال کیا ہے؟

رسوا: وہ ایک حکیم صاحب پر مرتی ہیں۔

امراؤ: کون حکیم صاحب؟

رسوا: آپ نہیں جانتیں، نام بھی بتا دوں گا، تب بھی آپ نہیں سمجھیں گی!

پھر کیا فائدہ؟

امراؤ: خیر کچھ بتا دیجئے، میں سمجھ جاؤں گی۔



رسو: وہ نخاس.....

امراؤ: خوب جانتی ہوں۔ یہی امیر جان اس زمانے میں ایسی تھیں کہ لوگ ان کو ایک نظر دیکھنے کی آرزو کرتے تھے۔ مزاج میں وہ تمکنت تھی کہ ایسے ویسے کا تو ذکر ہی کیا ہے، اچھے اچھوں کی دعا قبول نہ ہوتی تھی۔ ٹھاٹھ بھی ایسے ہی تھے۔ چار چار مہرباں ساتھ۔ ایک گڑگری لیے ہے ایک کے ہاتھ میں پنکھا ہے، ایک کے پاس خاصدان ہے۔ خدمت گار و ردیاں پہنے سواری کے ساتھ دوڑتے جاتے ہیں۔

امیر جان، گوہر مرزا کے گانے پر غش تھیں۔ خود گانا جانتی نہیں تھیں، مگر گانا سننے کا بڑا شوق تھا۔ گوہر مرزا بچپن ہی سے رنڈیوں کا کھلونا تھا۔ ہر ایک اس پر دم دیتی تھی۔ صورت شکل بھی پیار کرنے کے قابل تھی۔ رنگ تو کسی قدر سانولا تھا، مگر ناک نقشہ قیامت کا پایا تھا۔ اس پر نمک اور جامہ زیبی، شوخی، شرارت کوئی بات.....!

رسو: کیوں نہ ہو، کس ماں کا بیٹا تھا!

امراؤ: اہا! تو کیا آپ نے بنو کو بھی دیکھا تھا؟

رسو: (مسکراتے ہوئے) جی ہاں آپ یہی قیاس کر لیجیے۔

امراؤ: مرزا صاحب! آپ کے مذاق بھی کیا در پردہ ہوتے ہیں!

رسو: خیر آپ نے تو پردہ فاش کر دیا۔

امراؤ: تو اچھا اب تھوڑی دیر مذاق ہی رہے۔ میری سرگزشت کو آگ لگائیے۔

رسو: مذاق کے لیے شب بھر باقی ہے، آپ اپنا قصہ کہیے۔

امراؤ: دیکھیے دوسری ہوئی۔ اچھا سنئے۔

صبح سے دس گیارہ بجے تک تو مولوی صاحب کے پاس سے کس کی مجال تھی کہ دم بھر کے لیے کہیں کھسک جائے۔ اس کے بعد مولوی صاحب خاصہ کھانے جاتے تھے۔ اس وقت ہم کو فرصت ملتی تھی۔ پھر ایک ایک کمرہ اور ہم ہیں۔ آج امیر جان کے پاس، کل جعفری کے کمرے میں، پرسوں بہن کے ہاں، پھر جہاں جاؤ خاطر مدارات، میوہ مٹھاپاں، حقہ پان۔



رسوا: آپ بچپن ہی سے حقہ پیتی ہیں؟  
امراؤ: جی ہاں! گوہر مرزا کی دیکھا دیکھی مجھے بھی ہوس ہوئی تھی، شوقہ پیتی تھی، پھر گھوڑی لت ہو گئی۔

رسوا: گوہر مرزا صاحب تو چندو بھی پیتے تھے۔ عجب نہیں آپ نے اس میں بھی ان کی ہوس کی ہو؟

امراؤ: خدا نے اس سے تو آج تک بچایا، مگر ہاں افیون کی قسم نہیں کھاتی۔ وہ بھی اب شروع کی ہے۔ کربلائے معلیٰ سے آنے کے بعد نزلے کی شدت ہوئی، آئے دن زکام رہتا تھا۔ حکیم صاحب نے کہا افیون کھاؤ، کھانے لگی۔

رسوا: اور وہ چیز نزلے کو روکنے والی؟

امراؤ: اب اس کا ذکر نہ کیجیے۔

رسوا: کیا تائب ہو گئیں؟

امراؤ: مدت سے۔

رسوا: واقعی کیا بری چیز ہے، اپنا تو یہ حال ہے:

بعد توبہ کے بھی ہے دل میں یہ حسرت باقی

دے کے قسمیں کوئی اک جام پلا دے، ہم کو

امراؤ: ہائے کیا شعر کہا ہے! مرزا صاحب! قسمیں دلانے کو تو میں ہوں

پینے نہ پینے کا آپ کو اختیار ہے۔

رسوا: آپ بھی شغل کیجیے گا؟

امراؤ: توبہ!

رسوا: توبہ!

اب بھی ہے ہوائے سرد بھی ہے

پھر وہ یادش بخیر یاد آئی

امراؤ: بس اب طبیعت کو روکیے، جمائیاں آنے لگیں، اللہ اس ذکر کو جانے

دیکھیے۔

جانے دیجیے۔

رسوا:

مذاق سے بھی معاف رکھیے۔

امراؤ:

اب نہ ہم منہ لگائیں گے اس کو

یاد آئی تو خیر یاد آئی!

واللہ امر او جان کیا شعر ہے!

رسوا:

تسلیم۔

امراؤ:

دیکھ کے مشہد ادا ان کو

لالہ و گل کی سیر یاد آئی!

ماشاء اللہ! طبیعت زوروں پر ہے۔ کیوں نہ ہو عالم شباب کے

رسوا:

ذکر کی تاثیر ہے۔

جی نہیں شراب کے ذکر کی تاثیر ہے:

امراؤ:

زاہدو! آج ہم کو پھر وہ شے

جس سے ہے تم کو بیر یاد آئی

آہا ہا ہا! کیا قافیہ نکالا ہے اور کہا بھی خوب ہے!

رسوا:

امراؤ:

کعبے سے پھر کے ہم ہوئے گمراہ

پھر وہی راہ دیر یاد آئی

اے کیا کہنا! یہ ”کعبے سے پھر کے“ کیا خوب کہا ہے!

رسوا:

مرزا صاحب! اسے مطلع نہ کر دیجیے۔

امراؤ:

پھر کے کعبے سے سیر یاد آئی

پھر ہمیں راہ دیر یاد آئی

خاصہ

رسوا:

امراؤ:

روش وحش و طیر یاد آئی

دشت وحشت کی سیر یاد آئی

یہ مطلع بھی برا نہیں ہے۔

رسوا:

یہ شعر ملاحظہ ہو۔

امراؤ:

ہم کو بنت العجب سے شکوہ ہے

کیوں ہمیں اس بغیر یاد آئی

میں تو کہتا ہوں کہ طبیعت آج جودت پر ہے۔ اچھا یہ شعر سن لیجیے اور پھر اپنا قصہ دہرانا شروع کیجیے۔

رسوا:

ہوا بھی، ابر بھی، گلزار بھی، شراب بھی ہو!

یہ سب تو ہو، مگر اگلا سا وہ شباب بھی ہو

امراؤ:

واہ مرزا صاحب! آپ نے تو دل ہی مردہ کر دیا۔ خیر آدم بر سر مطلب۔ اسی طرح سے کئی برس میری زندگی کے خانم کے مکان پر گزرے اس درمیان میں کوئی ایسا واقعہ نہیں گزرا جس کا بیان ضروری ہو۔ ہاں خوب یاد آیا۔ بسم اللہ کی مسی بڑی دھوم سے ہوئی۔ میری آنکھوں کے دیکھتے شاہی سے لے کر اب تک پھر ویسی مسی نہیں ہوئی۔ دلارام کی بارہ دری اس جلسے کے لیے سجائی گئی تھی۔ اندر سے باہر تک روشنی تھی۔ شہر کی رنڈیاں، ڈوم، ڈھاڑی، کشمیری بھانڈ سب ہی تو تھے۔ دور دور سے ڈیرہ دار طوائفیں بلائی گئی تھیں۔ بڑے بڑے نامی گویے دلی سے آئے تھے۔ سات دن رات گانے بجانے کی صحبت رہی۔ خانم نے جیسا دل کھول کے حصے تقسیم کیے ہیں اس کا آج تک شہرہ ہے۔ بسم اللہ خانم کی اکلوتی لڑکی تھی جو کچھ نہ ہوتا کم تھا۔ نواب جھبن صاحب نے اپنی دادی نواب عداۃ الحاقان بیگم کا ورثہ پایا تھا۔

بہت ہی کم سن نواب زادہ تھا۔ خانم نے خدا جانے کن ترکیبوں سے کیا مارا بے چارہ پھنس ہی تو گیا۔ پچیس تیس ہزار روپے نواب صاحب کے اس جلسے میں خرچ ہوئے۔ اس کے بعد بسم اللہ نواب صاحب کی ملازم ہوئیں۔ دم ہوش چاہتے تھے۔

مرزا صاحب! جو باتیں آپ مجھ سے پوچھتے ہیں ان کا میری زبان سے نکلنا سخت مشکل ہے۔ یہ سچ ہے کہ رنڈیاں بے باک ہوتی ہیں مگر اس بے باکی کا ایک خاص زمانہ ہوتا ہے۔ سن کا تقاضا بھی کوئی چیز ہے۔ جوش جوانی کی وجہ سے جو باتیں اپنی حد سے گزر جاتی ہیں سن سے اتر کر ان میں کمی ضرور ہونا چاہئے تاکہ اعتدال قائم رہے۔ آخر رنڈیاں بھی عورت ذات ہیں ان باتوں کے پوچھنے سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟

رسوا: کچھ تو فائدہ ہے جو میں اصرار کر کے پوچھتا ہوں۔ اگر آپ خواندہ نہ ہوتیں تو آپ کے یہ سب عذر قابل سماعت ہوتے۔ پڑھے لکھوں کو ایسی بے جا شرم نہیں چاہیے۔

امراد: اولیٰ! تو کیا پڑھنے لکھنے سے آنکھوں کا پانی ڈھل جاتا ہے؟ یہ آپ نے خوب کہی!

رسوا: اچھا اچھا تو آپ کہیے فضول باتوں سے میرا وقت ضائع نہ کیجیے۔

امراد: کہیں کسی اخبار میں نہ چھپوا دیجیے گا۔

رسوا: اور آپ کیا سمجھتی ہیں؟

امراد: ہائے فضیحت! تو بہ کیجیے یہ مجھے بھی آپ اپنی طرح رسوا کریں گے۔

رسوا: خیر اگر میرے ساتھ آپ رسوا ہوں گی تو کوئی قباحت نہیں:

رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم

چھوڑوں گا اب نہ میں تمہیں رسوا کیے بغیر

امراد: نوج آپ سے کوئی محبت کرے!



زاہد سے گفتگو ہو کہ ناصح سے بحث ہو

بنتی نہیں ہے ذکر کسی کا کیے بغیر

کس کا شعر ہے؟

رسوا:

یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں؟

امراؤ:

ہاں سمجھا۔ تو یہ کہیے کہ آپ نے بھی یہ غزل سنی ہے۔

رسوا:

امراؤ:

جاتے ہیں جان بیچ کے بازار عشق میں

ہم آئیں گے نہ حسن کا سودا کیے بغیر

اور وہ شعر یاد ہے۔ 'تقاضا کیے بغیر'؟

رسوا:

امراؤ:

وعدہ ہو یا کہ قول وہ ایسے ہی نادہند

ملتا نہیں کچھ ان سے تقاضا کیے بغیر

اور کوئی شعر یاد ہے؟

رسوا:

اور تو کوئی یاد نہیں آتا۔

امراؤ:

یہ تو بہت بڑی غزل تھی دیکھنا کہیں پڑی ہو تو مجھے دکھانا۔

رسوا:

انہی سے نہ منگواؤ؟

امراؤ:

خود جا کے لکھ لاؤں تو ممکن ہے۔ وہ تو ہرگز نہ لکھیں گے۔

رسوا:

یہ بھی کوئی بات ہے؟

امراؤ:

جی ہاں آپ کو نہیں معلوم مسودے کے سوا غزل صاف کرنے

رسوا:

تک کی قسم ہے۔

اچھا ایک دن ہم اور آپ دونوں چلیں۔ ہاں ایک شعر یاد آیا:

امراؤ:

ہر چند اس میں آپ ہی بدنام کیوں نہ ہوں

باز آئیں گے نہ وہ مرا چہ چاہے بغیر

اور سنئے:

غیروں کو ہے ستم کے تقاضے کا حوصلہ  
چھوڑیں گے یہ نہ عشق کو رسوا کیے بغیر  
میری بھی غزل اسی طرح میں تھی، مگر خدا جانے کیا ہوئی، صرف  
مقطع یاد رہ گیا تھا۔

رسوا:

مقطع پھر سنائیے، کیا خوب کہا ہے!

امراؤ:

رسوا:

رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم  
چھوڑوں گا اب نہ میں تمہیں رسوا کیے بغیر  
واقعی خوب کہا ہے! مگر اس میں آپ کے تخلص نے خاص لطف  
دیا ہے۔

امراؤ:

تخلص کا ذکر نہ کیجیے۔ ایک عنایت فرما کی عنایت سے شہر میں  
اب کئی رسوا موجود ہیں۔ لوگ خواہ مخواہ اپنے اچھے خاصے تخلص  
چھوڑ کے رسوا ہوئے جاتے ہیں۔ وہ تو کہیں میرا نام نہیں جانتے،  
نہیں تو کیا عجب ہے لوگ نام بھی بدل ڈالیں، مگر میں تو خوش  
ہوں اس لیے کہ انگریزی رسم کے مطابق باپ بیٹوں کا نام ایک  
ہی ہوتا ہے۔ یہ سب میرے روحانی فرزند ہیں۔ جس قدر نسل  
ترقی کرے گی میرا نام روشن ہوگا۔

رسوا:

لے اب ٹالے نہ جو کچھ میں نے پوچھا ہے وہ کہنا ہی پڑے گا۔

امراؤ:

کیا زبردستی؟ کیا بے شرمی کی باتیں آپ پوچھتے ہیں۔

رسوا:

بیاباہ براتوں میں گالیاں گانے سے زیادہ بے شرمی نہ ہوگی!

امراؤ:

آپ کے لکھنؤ میں تو رنڈیاں گالیاں نہیں گاتیں، ڈونیاں البتہ  
گاتی ہیں، وہ بھی عورتوں میں۔ دیہات کی رنڈیوں کو گانا پڑتی  
ہیں مردوں میں۔ واقعی مرزا صاحب شہر ہو یا دیہات، یہ رسم تو  
کچھ اچھی نہیں ہے۔

رسوا:

آپ کے کہنے سے اچھی نہیں ہے۔ ہم نے ان آنکھوں سے

دیکھا ہے اور ان کانوں سے سنا ہے اچھے اچھے شریف مرد آدمی  
عورتوں میں گھس کے شوقیہ گالیاں سنتے ہیں۔ ماں بہنیں پنی جا  
رہی ہیں اور یہ خوش ہیں باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ آج خدا نے یہ  
دن دکھایا۔ کاش خدا یہ دن نہ دکھاتا۔ اس کے علاوہ برات کی  
رات بھر اور صبح کو جو بے ہودگیاں باعصمت بہو بیٹیوں میں ہوتی  
ہیں اس کا ذکر بھی فحش سے خالی نہیں۔ خیر ان باتوں کو رہنے  
دیتے آپ بتی کہیے۔ ہم کوئی مصلح قوم نہیں جو ان باتوں پر نکتہ  
چینی کریں۔

امراؤ: آپ نہ مانئے گا لے سنئے۔

جب سے بسم اللہ کی مسی ہوئی خورشید جان اور امیر جان کے کارخانے دیکھے میرے دل  
میں ایک خاص قسم کی اسنگ پیدا ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک خاص رسم (جس سے بالکل ناواقف  
تھی) کے ادا ہونے کے بعد بسم اللہ سے بسم اللہ جان اور خورشید سے خورشید جان ہو گئیں۔ بے  
باکی کی سند حاصل ہو گئی آزادی کا خلعت مل گیا۔ اب یہ لوگ مجھ سے علیحدہ ہو گئے۔ میں ان کی  
نگاہوں میں حقیر سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مردوں کے ساتھ بے تکلف ہنسی مذاق کرنے لگی تھیں۔ ان  
کے کمرے جدا جدا سجادیے گئے تھے۔۔۔ نواڑ کے پلنگ ڈوریوں سے کسے ہوئے فرش پر ستھری  
چاندنی کھینچی ہوئی بڑے بڑے نقش پاندان، مقابے حسن دان، خاں دان، اگال دان اپنے قرینوں  
سے رکھے ہوئے۔ دیواروں پر حلبی آئینے، عمدہ عمدہ تصویریں، چھت میں چھت گیریاں لگی ہوئی،  
جس کے درمیان ایک مختصر سا حجام، ادھر ادھر باندیاں۔ سرشام سے دو کنول روشن ہو جاتے ہیں۔  
دو دو مہریاں، دو دو خدمت گار ہاتھ بندھے کھڑے ہیں۔ خوب صورت نو جوان رئیس زادے ہر  
وقت دل بہلانے کو حاضر چاندی کی گڑگری منہ سے لگی ہوئی ہے سانسے پاندان کھلا ہوا ہے ایک  
ایک کو پان لگا کے دیتی جاتی ہیں۔ اٹھتی ہیں تو لوگ بسم اللہ کہتے ہیں، چلتی ہیں تو لوگ آنکھیں  
بچھائے دیتے ہیں۔ یہ ہیں کہ کسی کی پرواہی نہیں کرتیں۔ جو ہے انہی کے حکم کا تابع ہے۔ حکومت  
بھی وہ کہ زمین آسمان ٹل جائے مگر ان کا کہنا نہ ٹلے۔ فرمائشوں کا تو ذکر ہی کیا، بن مانگے لوگ  
کلیجہ نکال نکال کر دیے جاتے ہیں۔ کوئی دل ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے کوئی جان قربان کرتا  
ہے۔ یہاں کسی کی نذر ہی نہیں قبول ہوتی، کوئی بات نظر میں نہیں ساتی۔ بے پروائی یہ کہ جان بھی



دے دے تو ان کے نزدیک کوئی مال نہیں۔ غرور ایسا کہ ہفت اقلیم کی سلطنت ان کی ٹھوکر پر ہے۔ ناز وہ جو کسی سے اٹھایا نہ جائے، مگر اٹھانے والے اٹھاتے ہیں۔ انداز وہ جو مار ہی ڈالے، مگر مرنے والے مر ہی جاتے ہیں۔ ادھر اس کو رلا دیا ادھر اسے ہنسا دیا۔ کسی کے کلیجے میں چٹکی لے لی، کسی کا دل تلوؤں سے مسل ڈالا، بات بات میں روٹھی جاتی ہیں، لوگ منا رہے ہیں۔ کوئی ہاتھ جوڑ رہا ہے، کوئی منت کر رہا ہے۔ قول کیا اور مکر گئیں، قسم کھائی اور بھول گئیں۔ محفل بھر میں سب کی نگاہیں ان کی طرف ہیں، یہ آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتیں۔ پھر جدھر دیکھ لیا، ادھر ہی سب دیکھنے لگے۔ جس پر ان کی نگاہ پڑتی ہے اس پر ہزاروں نگاہیں پڑتی ہیں۔ رشک کے مارے لوگ جلے جاتے ہیں اور یہ جان جان کے جلا رہی ہیں۔ اور لطف یہ کہ دل میں کچھ بھی نہیں۔ وہ بھی چیخ ہے، یہ بھی چیخ ہے، فقط بناوٹ۔ اگر وہ بے چارہ اس فریب میں آ گیا، پھر کیا تھا، پہلے بظاہر خود مرنے لگیں:

آج کل ان کو بہت ہے مری خاطر منظور

یا مری یا مرے دشمن کی قضا آئی ہے

مریں ان کے دشمن، آخر اسی کو مار ڈالا اب جا کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑی۔ اس غریب کے گھر میں رونا پیٹنا پڑا ہے۔ یہ بیٹھی پاروں کے ساتھ تہقہ لگا رہی ہیں۔

مرزا صاحب! ان سب باتوں کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں اور بیان کر سکتے ہیں، مگر یہ کرشمے دیکھ دیکھ کے جو کچھ میرے دل پر گزرتی تھی، ان کو میں ہی خوب جانتی ہوں۔ عورت کو عورت سے جو رشک ہوتا ہے اس کی کچھ انتہا نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے، اگرچہ مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے، میرا دل چاہتا تھا کہ سب کے چاہنے والے مجھی کو چاہیں، اور سب کے مرنے والے مجھی پر مریں۔ نہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھیں، نہ کسی پر جان دیں۔ مگر میری طرف کوئی آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا تھا۔ بوا حسینی کی کوٹھری جو درود یوار سے لے کر چھت تک دھوئیں سے سیاہ تھی، اس کے ایک طرف جھلنگا پلنگ پڑا ہوا تھا۔ اس پر ہم اور بوا حسینی رات کو پڑ رہے تھے۔ ایک طرف اس کوٹھری میں چولہا بنا ہوا تھا، اس کے پاس دو گھڑے رکھے ہوئے تھے۔ یہیں دو بدلتی پتیلیاں، لگن، توا، رکابیاں، پیالے ادھر ادھر پڑے رہتے تھے۔ ایک کونے میں آنے کی مٹکی رکھی رہتی تھی۔ اس کے اوپر دو تین دالیں، نمک، مصالحہ ہنڈیوں میں، اسی کے پاس جلانے کی لکڑیاں، سوختے، مصالحہ پینے کی سل، بنا۔ خلاصہ یہ کہ تمام کرکری خانہ یہیں تھا۔ چولھے کے اوپر دیوار میں دو کیلیں لگی تھیں،



کھانا پکاتے وقت اس پر چراغ رکھ دیا جاتا تھا۔ چراغ میں پتلی سوت کی بتی پڑی ہے۔ موائے اندھا اندھا جل رہا ہے۔ لاکھ اکساؤ لو اونچی نہیں ہوتی۔ اس کوٹھری کی آرائش میں دو چھینکے بھی تھے۔ ان میں سے ایک میں پیاز رہتی تھی اور دوسرے میں سالن، دال کی پتیلی، چپاتیاں، مولوی صاحب کے واسطے ڈھانک کے رکھ دی جاتی تھیں۔ پیاز والا چھینکا تو چولھے کے قریب تھا اگر پلنگ پر اچانک اٹھ کھڑی ہوئی تو سالن کی یہ پتیلی کھٹ سے سر میں لگی۔ صبح سے گیارہ بجے تک مولوی صاحب کی قمچیاں اور شام سے نو بجے تک استاد کی جھڑکیاں اور سارنگی کے گزروں کی مار۔ یہ ہمارا پیارا خلاص تھا۔ یہ سب کچھ تھا، مگر میں اپنے کرتوتوں سے باز نہ آتی تھی۔

اول اول تو مجھے آئینہ دیکھنے کا شوق ہوا۔ اب میرا سن چودہ برس کا تھا۔ ادھر بوا حسینی کوٹھری سے ٹلیں ادھر میں نے ان کی پٹاری سے آئینہ نکالا اپنی صورت دیکھنے لگی۔ اپنا ناک نقشہ اور رنڈیوں سے ملاتی تھی۔ مجھے اپنے چہرے بھر میں کوئی چیز بری نہ معلوم ہوتی تھی بلکہ اوروں سے اپنے کو بہتر سمجھتی تھی، اگرچہ درحقیقت ایسا نہ تھا۔

رسوا: تو کیا آپ کی صورت کسی سے بری تھی؟ اب بھی سینکڑوں سے اچھی ہو اس وقت تو اور بھی جو بن ہوگا۔

امراء: تسلیم! خیر اب اس تعریف کو رہنے دیجئے بالکل بے محل اور بے موقع ہے، معاف کیجئے گا۔ مگر ہاں اس وقت میرا ایسا ہی خیال تھا اور یہ خیال میری جان کے لیے آفت تھا۔ میں دل ہی دل میں کہتی تھی، ہائے مجھ میں کیا برائی ہے جو کوئی میری طرف توجہ نہیں کرتا۔

رسوا: یہ تو ممکن نہیں کہ کسی کی آپ کی طرف توجہ نہ ہو، نگاہیں ضرور پڑتی ہوں گی، مگر بات یہ تھی کہ آپ کی مسی نہیں ہوئی تھی۔ خانم سے لوگ ڈرتے تھے اس لیے آپ سے کوئی نہ بولتا ہوگا۔

امراء: شاید یہی ہو، مگر مجھے اتنی تمیز کہاں تھی۔ میری تو وہ مثل تھی ”بی دوتی اپنے چہرے میں آپ کسوتی“ اپنی ہجولیوں کو دیکھ دیکھ کے پھٹکی جاتی تھی، کھانا پینا حرام تھا، راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔

اسی زمانے میں پھر کنگھی چوٹی کا شوق ہوا۔ کنگھی کرتے وقت اور بھی صدمہ ہوتا تھا، اس لیے

کہ کوئی چوٹی گوندھنے والا نہ تھا۔ جب بسم اللہ کی چوٹی نواب چھین صاحب اپنے ہاتھ سے گوندھتے تھے میرے سینے پر سانپ لوٹ جاتا تھا۔ یہاں کون تھا؟ وہی بوا حسینی وہ بھی جب انہیں فرصت ہوئی، نہیں تو دن دن بھر بال کھلے ہیں، سر جھاڑ منہ پہاڑ پھر رہی ہوں، آخر میں نے اپنے ہاتھ سے چوٹی گوندھنا سیکھا۔ اور سب رنڈیاں دن میں تین جوڑے بدلتی تھیں، یہاں وہی آٹھویں دن۔ پوشاک بھی بھاری نہ تھی۔ وہ لوگ کار چوٹی جوڑے پہنتی تھیں، یہاں وہی گلبدن کا پاجامہ، ململ کا دوپٹا، بڑی بڑائی ہوئی کچھے کی تیلی دے دی گئی۔

اس پر بھی کپڑے بدل کے میرا جی چاہتا تھا کہ مردوں میں جا کے بیٹھوں۔ کبھی بسم اللہ کے کمرے میں چلی گئی، کبھی امیر جان کے پاس، مگر جہاں جاتی تھی کسی نہ کسی بہانے سے اٹھا دی جاتی تھی۔ ان لوگوں کو میرا بیٹھنا ناگوار تھا۔ سب کو اپنی مزیداریوں کا خیال تھا، مجھے کون بیٹھنے دیتا! اور نہ بیٹھنے دینے کا ایک اور بھی سبب تھا کہ ان دنوں میری طبیعت میں شرارت کسی قدر سما گئی تھی۔ جہاں بیٹھی کسی کو ٹھینکا دیکھا دیا، کسی کو منہ چڑھا دیا، کسی کے چنگی لے لی۔ ہر طرح مردوں سے لگاؤ کرتی تھی۔ اس وجہ سے لوگ میرے بیٹھنے کے روادار نہ تھے۔

مرزا صاحب! آپ سمجھ سکتے ہیں کہ گوہر مرزا ایسے وقت اور اس حالت میں مجھے کس قدر غنیمت معلوم ہوتا تھا، اس لیے کہ وہ مجھ سے پیار کی باتیں کرتا تھا۔ میں اس کو چھیڑتی تھی وہ مجھے چھیڑتا تھا۔ میں اسی کو اپنا چاہنے والا سمجھتی تھی اور وہ بھی ان دنوں مجھ کو چاہتا تھا۔ جب صبح مکتب میں آتا، کہیں دو نارنگیاں جیب میں پڑی ہیں، مجھے چپکے سے دے دیں۔ کسی دن حلو اسوہن کی ٹکیہ لیتا آیا، مجھ کو کھلا دی۔ ایک دن نہیں معلوم کہاں سے ایک روپیہ لایا تھا، وہ بھی مجھے حوالے کر دیا۔ ہزاروں روپے میں نے اپنی زندگی میں اپنے ہاتھ سے اٹھائے ہوں گے، مگر اس ایک روپے کے پانے کی خوشی کبھی نہ بھولوں گی۔ اس سے پہلے مجھے پیسے تو بہت ملے تھے، مگر روپیہ کبھی نہ ملا تھا، وہ روپیہ بہت دنوں تک میں نے جگور رکھا، اس لیے کہ اس کے صرف کی کوئی ضرورت مجھے نہ تھی اور اگر تھی بھی تو یہ خیال تھا کہ اگر یہ صرف کرتی ہوں کہ لوگ پوچھیں گے کہاں سے ملا، تو کیا بتاؤں گی؟ رازداری کی سمجھ مجھے بھی آگئی تھی، اور یہ سمجھ بغیر سن تیز کو پہنچے نہیں آتی۔ بے شک میں سن تیز کو پہنچ چکی تھی۔

## ۵

ایک شاطر چور دل میرا چرا کے لے گیا  
پاسباں کم بخت سب سوتے کے سوتے رہ گئے

برسات کے دن ہیں۔ آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ پانی تل دھار اوپر دھار برس رہا ہے۔  
بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہا ہے۔ میں بوا حسینی کی کوٹھری میں اکیلی پڑی ہوں۔ بوا حسینی خانم  
کے ساتھ حیدری کے گھر گئی ہوئی ہیں۔ چراغ گل ہو گیا اندھیری وہ کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سو جھتا۔  
اور کمروں میں جشن ہو رہے ہیں۔ کہیں سے گانے کی آواز آرہی ہے کہیں تہقے اڑ رہے  
ہیں ایک میں ہوں کہ اس اندھیری کوٹھری میں اپنی تنہائی پر رو رہی ہوں۔ کوئی آس پاس نہیں ہے۔  
دل پر جو گزر رہی ہے دل ہی جانتا ہے۔ جب بجلی چمکتی ہے مارے ڈر کے دولائی سے منہ ڈھانپ  
لیتی ہوں۔ جب گرج کی آواز آتی ہے کانوں میں انگلیاں دے دیتی ہوں۔ اسی عالم میں میری  
آنکھ لگ گئی۔ اتنے میں معلوم ہوا جیسے کسی نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔ میری کھانسی بندھ گئی۔  
منہ سے آواز تک نہ نکلی۔ آخر بے ہوش ہو گئی۔۔۔ صبح کو چور کی ڈھونڈیا ہوئی۔ وہ کہاں ماتا ہے!  
خانم منہ تھوٹھائے بیٹھی ہیں بوا حسینی بڑبڑاتی پھرتی ہیں۔ میں ٹھگ ماری سی چپکی بیٹھی ہوں۔ سب  
پوچھ پوچھ کے تھک گئے مگر مجھے کچھ معلوم ہو تو بتاؤں۔

رسوا: یہ نہیں کہتیں کہ اگر معلوم بھی ہو تو کیوں بتاؤں۔

امراؤ: خیر اب حاشیے نہ چڑھائیے۔ سنتے جائیے۔

خانم کی اس دن کی مایوسی اور بوا حسینی کا اداس چہرہ جب مجھے یاد آتا ہے تو بے اختیار ہنسی  
آ جاتی ہے۔

رسوا: کیوں نہ ہنسی آئے ان کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں اور  
آپ کا مذاق ہو گیا۔

امراؤ: امیدیں خاک میں مل گئیں؟ خانم کو آپ نہیں جانتے ایک ہی  
لکھوا بیسواتھیں۔ اس معاملے کو اس طرح دبا دیا جیسے کچھ ہوا ہی  
نہ تھا اور التیام کی وہ تدبیریں کیں کہ شاید دبا دے۔



اب کسی آنکھ کے اندھے اور گناٹھ کے پورے کی تلاش ہوئی۔ آخر ایک ہمد پھنس ہی گیا۔ ان دنوں ملک آئین سے ایک صدر الصدور کے صاحب زادے طالب علمی کے لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ گھر سے خوش والد مرحوم ان کے رشوت نذرانے کے روپے سے ایک بڑا علاقہ ان کے صرف بے جا کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ چند روز یہاں آ کر اچھے رہے پھر جو لکھنؤ کی ہوا لگی، علم تماش بنی میں طاق اور فن بے غیرتی میں مشاق ہو گئے۔ اسم شریف راشد علی تھا۔ راشد تخلص کرتے تھے لکھنؤ کے کسی استاد نے مرشد بنا دیا۔ اس تخلص پر آپ کو بہت ہی فخر تھا۔

وطن سے جو ملازم ہم راہ آئے تھے وہ سب رکھن میاں کہتے تھے۔ لکھنؤ والوں نے ان کو راجا کا لقب دیا، مگر اس نام اور القاب میں کسی قدر دیہاتیت تھی اور آپ لکھنؤ کی وضع قطع پر مرتے تھے اس لیے تھوڑے ہی دنوں میں نواب صاحب بن گئے۔ جب گھر سے آئے تھے تو خاصی داڑھی منہ پر تھی، لکھنؤ کی ہوا لگتے ہی پہلے کتر واں ہوئی، پھر خشخاشی اور تھوڑے دنوں کے بعد بالکل صفایا ہو گیا۔ داڑھی منڈانے سے چھوٹا سا چہرہ کیسا بد نما نکل آیا، مگر آپ اسے خوبصورتی سمجھتے تھے۔ سیاہ رنگ، چچک کے داغ، بھدی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، گال پیچکے ہوئے، تنگ پیشانی، کوتاہ گردن، ٹھنگنا ساق، غرض یہ کہ ہمہ صفت موصوف تھے، مگر آپ اپنے کو یوسف ثانی سمجھتے تھے۔ پہروں آئینہ سامنے رہتا تھا۔ مونچھیں اس قدر مروڑی گئیں کہ آخر چوہیا کی دم ہو گئیں۔ بال بڑھائے گئے، گھونٹھر بنایا گیا، نکلے دار ٹوپی سر پر رکھی گئی، اونچی چولی کا انگرکھا ڈانٹا گیا، بڑے پائینچوں کا پا جامہ پہنا گیا۔ یہ سب ٹھاٹھ رنڈیوں کی دربارداری کے لیے کیا گیا تھا۔

اول تو خود ہی طبیعت بہت رساتھی، دوسرے لائق احباب کی وساطت سے چند ہی روز کے بعد اونچے اونچے کمروں پر رسائی ہو گئی۔ رسائی کیسی بے تکلفی بڑھ گئی۔ چھٹن جان سے مادر پدر ہوتا ہے، لیکن ٹیمپیں لگاتی ہیں، حسنانے جو تا کھینچ مارا، آپ ہیں کہ ٹھی ٹھی ہنس رہے ہیں۔ یہ سب کچھ تھا، مگر ناکاؤں کا بڑا ادب کرتے تھے، جس رنڈی سے ایک شب کے لیے بھی واسطہ ہو گیا، اس کی ناکہ کو جمع عام میں اماں جان کہنا اور جھک کے تسلیم کرنا عین سعادت مندی تھی۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ یاروں پر ظاہر ہو جاتا تھا کہ آپ یہاں مشرف ہو چکے ہیں۔

سر شام دو تین گھنٹی رات گئے تک خانم صاحب کا دربار کرتے تھے۔ ان کی ہر ایک نوچی کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ علم موسیقی میں بھی آپ کو کمال تھا۔ ٹھریاں خود تصنیف فرماتے، خود ہی دھن بنا کے گاتے تھے، خود ہی بھاؤ بتاتے جاتے تھے۔ اور تو جو کچھ تھامنہ سے طبلہ خوب بجاتے



تھے۔ یاروں نے خوب ہی بنالیا تھا۔ آپ کے اشعار پر لوگوں نے اتنی تعریف کی کہ آپ کو فخر آتش و ناسخ بنا دیا۔ مشاعروں میں ڈریا لے گئے۔ آپ سے غزل پڑھوائی، تمام مشاعرہ چومک گیا۔ ریختی گویوں سے پہلے آپ کا کلام پڑھا جاتا تھا۔ ہنستے ہنستے لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ لوگ بناتے تھے آپ خوش ہوتے تھے جھک جھک کے تسلی میں کرتے تھے۔

وطن سے بے غل و غش روپیہ چلا آتا تھا۔ ان کی والدہ بے چاری اس خیال سے کہ لڑکا پڑھنے گیا ہے، مولوی بن کے آئے گا، جو کچھ یہ لکھ بھیجتے تھے، بھیج دیتی تھیں۔ لکھنو کے بے فکرے، خوش پوشاک، عیش پسند، مفت خورے آپ کے ہمراہ رہتے تھے۔ انہیں لوگوں کے کہنے سننے پہ کچھ خیال پیدا ہوا۔ اس خیال نے ترقی کرتے کرتے اشتیاق تک نوبت پہنچائی۔ آخر کو عشق اور اس کے بعد جنون ہو گیا۔ ادھر خانم نے کھنچاؤ کیا۔ خانم کا یہ کہنا ”نا صاحب! ابھی وہ کم سن ہے“ اور ان کی التجا، منت و زاری، بے قراری آج تک مجھے یاد ہے۔ آخردعا تعویذ کی تاثیر اور غم خواروں کی دوا دوش سے پانچ ہزار روپے پر توڑ ہوا۔ اس روپے کے لینے کے لیے آپ کو چند روز کے لیے وطن جانا پڑا۔ ماں سے چھپا کے دو گاؤں آپ نے رہن کر دیے۔ بیس پچیس ہزار روپے لے کے لکھنو آئے۔ پانچ توڑے گن دیے۔

روپیہ عین المال دیوان جی کی معرفت خانم کے خزانہ عامرہ میں داخل ہوا۔ بوا حسینی نے پاؤں پھیلائے، پانچ سو روپے نذر و نیاز کے نام سے لے لیں۔ خلاصہ یہ میں آپ کے سر منڈھ دی گئی۔ چھ مہینے تک آپ لکھنو میں رہے، سو روپے ماہ وار دیتے تھے، فرمائش کا ذکر نہیں۔ جو کچھ مجھے خفیہ دیا وہ بوا حسینی کے پاس رہتا تھا، خانم کو اس کی خبر نہ تھی۔ اب میں گویا آزاد ہو گئی۔ دو مہریاں خدمات گار میرے لیے خاص ملازم ہوئے۔ پچائیک کے پاس والا کرا میرے رہنے کے لیے سجادیا گیا۔ دو چار مرد آدمی شریف زادے، نواب زادے میرے پاس بھی آ کر بیٹھنے لگے۔

گل چین اول گوہر مرزا مجھ سے ہر زمانے میں برابر ملتا رہا۔ خانم اور بوا حسینی اس کی صورت سے جلتی تھیں۔ مجھے محبت تھی اس لیے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ ادھر گوہر مرزا کے والد نے انتقال کیا، جو آمدنی وہاں سے تھی وہ بند ہو گئی۔ بنو بڑھیا ہو چکی تھیں، کوئی پوچھتا نہ تھا، اس لیے گوہر مرزا کے صرف کی خبر گیری میرے ذمہ ہی تھی۔

سب رنڈیوں کا قاعدہ ہے کہ ایک نہ ایک کو اپنا بنا رکھتی ہیں۔ ایسے شخص سے بہت زیادہ فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب کوئی نہ ہو تو اسی سے دل بہلایا۔ سودے سلف کا آرام رہتا

ہے۔ آدمی سے منگاؤ تو کچھ نہ کچھ کھا جائے گا۔ یہ مارے خیر خواہی کے اچھی سے اچھی چیز شہر بھر سے ڈھونڈ کے لاتے ہیں۔ بیمار پڑو تو حد سے زیادہ خدمت کرتے ہیں۔ طرح طرح کے آرام دیتے ہیں۔ رات بھر پاؤں دباتے ہیں۔ صبح کو دوا بنائے پلاتے ہیں۔ حکیم صاحب سے حال کہنے جاتے ہیں۔ دوست آشناؤں میں تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ چرکٹ پھنسا کے لاتے ہیں۔ جہاں شادی بیاہ ہوا، ناچ کا انتظام اپنے ذمے لے کے بحرے میں انہی کو لے جاتے ہیں۔ محفل میں بیٹھ کے اہل محفل کو متوجہ کرتے ہیں۔ وہ ناچ رہی ہے یہ تال دیتے جاتے ہیں۔ ہر سم پر آہ کرتے ہیں، ہر تال پر واہ واہ کہتے ہیں۔ وہ بھاؤ بتا رہی ہے یہ شرح کرتے جاتے ہیں۔ انہی کی وجہ سے اچھے سے اچھا کھانا ملتا ہے۔ خاطر مدارت اور رنڈیوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ انعام و اکرام سوا ملتا ہے۔ اگر کسی رئیس امیر سے ملاقات ہوگئی، انہیں کی بدولت اس کو لطف رقابت حاصل ہوتا ہے۔ ادھر وہ چاہتے ہیں کہ رنڈی ہم کو چاہنے لگے، ادھر رنڈی جان جان کے ان کا کلمہ بھر رہی ہے۔ کبھی یہ فقرہ ”صاحب! میں ان کی پابند ہوں، نہیں معلوم آپ سے کیونکر ملتی ہوں۔ اب ان کے آنے کا وقت ہے، مجھے جانے دیجیے۔ وہ تو ہمیشہ کے ہیں، آپ اس طرح کیا بنا ہے گا۔“

تماش بین ان سے دبتے ہیں۔ اگر کسی سے کچھ تکرار ہوئی، یہ حمایت کو مستعد۔ شہر کے بانکے ترچھوں سے ملاقات، بات کی بات میں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو سکتے ہیں۔ تماش بین ایک طرف، خود ناکہ پر دباؤ رہتا ہے۔ ہر وقت یہ خوف لگا رہتا ہے رنڈی ان کو پیار کرتی ہے، کہیں ایسا نہ ہو ان کے ساتھ نکل کے گھر جا بیٹھے۔

امیر جان کاظم علی پر مرتی تھیں۔ برسوں اپنے پاس سے روپیہ دیا۔ ایک مرتبہ پانچ سو کے کڑے اتار کے دے دیے اور صبح کو غل مچا دیا کوئی اتار کے لیے گیا۔ ایک دفعہ جھالے کی ایک فرد گیارہ سو کے جوڑ کی دے دی اور کہہ دیا کہ عیش باغ کے میلے میں کان سے گر گئی۔ اسی طرح ہزاروں روپے کا سلوک کیا۔ گھر بھر کی روٹیاں امیر جان کی بدولت تھیں۔

خورشید پیارے صاحب پر جان دیتی تھیں۔ بسم اللہ کے کوئی آشنا نہ تھا۔ طبیعت میں سفلہ پن تھا، کسی پر بند نہ تھیں۔ اوروں کا ذکر کیا، خانم صاحب پچاس پچیس برس کے سن میں میرا اولاد علی پر جان دیتی تھیں۔ میر صاحب کا سن اٹھارہ انیس برس کا تھا۔ صورت دار تھے، جوان تھے، کسرتی بدن، اچھی اچھیوں کی نگاہ پڑتی تھی۔ خانم کا رعب غالب تھا، کیا مجال کوئی بات کر سکے۔ بے چارے غریب آدمی تھے، نان شبینہ کو محتاج، خانم کی بدولت سارا کنبہ پرورش پاتا تھا۔ ڈیڑھ ہزار

روپے لگا کے شادی کر دی، مگر برات کی رات کے سوا میر صاحب کو کبھی شب کو گھر میں سونا نصیب نہیں ہوا۔ دن رات یہیں رہتے تھے، گھڑی دو گھڑی کو گھر بھی ہوا تے تھے۔

ایک اور مرزا صاحب، کوئی ستر برس کا سن، کمر جھکی ہوئی، نہ منہ میں دانٹ نہ پیٹ میں آنت، خانم صاحب کے قدیم آشناؤں میں تھے۔ اب ان سے کوئی واسطہ نہ تھا، مگر گھر والوں کی طرح رہتے تھے۔ صبح شام کھانا خانم کے ساتھ کھاتے تھے۔ کپڑا خانم بنوادیتی تھیں۔ انیم، گنا، زیوڑیاں، ان سب اخراجات کا بار خانم کے سر تھا۔ ایک دن ہم لوگ خانم صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں، خورشید جان غم زدہ صورت بنائے بیٹھی ہیں۔ کیوں! پیارے صاحب کی شادی ہوئی ہے، ان پر غم سوار ہے۔ خانم نے براہ فہمائش کہا: ”جاؤ چھو کر یو! نہیں معلوم اس زمانے کی محبتیں کس قسم کی ہیں! جیسی رنڈیاں دیے ان کے آشنا۔ ایک ہمارا زمانہ تھا۔ دیکھو (مرزا صاحب کی طرف اشارہ کر کے) ایک یہی مرد آدمی بیٹھے ہیں، جوانی میں مجھ سے آشنائی ہوئی، ماں باپ نے شادی ٹھہرائی، آپ مانجھے کا جوڑا پہن کے مجھے دکھانے آئے۔ میں نے مانجھے کے جوڑے کے پرزے پرزے کر دیے ہاتھ پکڑ کے بیٹھ گئی کہ میں تو نہ جانے دوں گی۔ اس کو چالیس برس کا زمانہ گزرا، آج تک تو گھر نہیں گئے۔ کہو ہے کوئی ایسا تمہارا بھی؟“ سب نے سر جھکا لیا۔

## ۲

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے۔

یوں تو بسم اللہ کی مسمی میں پہلے پہل ناچی گائی تھی، مگر پہلا مجرا میرا نواب شجاعت علی خاں کے لڑکے کی شادی میں ہوا تھا۔ وہ محفل بھی یادگار تھی۔ نواب کی بارہ درہ کی کس شان سے سجائی گئی تھی۔ بیش قیمت شیشہ آلات کی روشنی سے رات کو دن ہو گیا تھا۔ صاف ستھرا فرش، ایرانی قالین، زربفت کے مسند، تکیے، سامنے رنگ رنگ کے مردگوں کی قطار روشن۔

عطر اور پھولوں کی خوشبو سے تمام بارہ درہ بسی ہوئی تھی۔ دھواں دھار حقوں اور گلواریوں کی خوشبو سے دماغ معطر تھے۔ میرا سن کوئی چودہ برس کا ہوگا۔ اس زمانے میں بڑودے سے ایک ہائی جی آئی ہوئی تھیں۔ تمام شہر میں ان کے گانے کی دھوم تھی۔ بڑے بڑے گویے کان پکڑتے تھے۔ معلومات ایسی کہ پوتھیاں گویا نوک زباں تھیں۔ گلا وہ کہ چار محلے ادھر آواز جائے۔ مگر واہ خانم صاحب! واقعی کیا رنگ محفل دیکھتی تھیں۔ ان کے بعد مجھ کو کھڑا کر دیا۔ مجھے تو کیا تمیز تھی، مگر سمجھ دار لوگ حیران تھے کہ خانم صاحب کرتی کیا ہیں۔ بھلا ہائی جی کے سامنے اس چھوکری کا رنگ کیسے جمنے گا۔



پہلے گت شروع ہوئی۔ اس میں محفل میری طرف مخاطب ہوئی۔ میری بھی اٹھتی جوانی تھی۔ صورت اچھی نہ تھی۔ مگر اس وقت کی پھرتی چالاکی الہڑپن!

کچھ نہ پوچھو شباب کا عالم  
کیا کہوں کچھ عجب زمانہ تھا!  
گت تھوڑی ہی دیر ناچی ہوں گی کہ خانم نے یہ غزل شروع کرادی۔

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے  
دیکھیے دیکھیے اک آن میں کیا ہوتا ہے  
اس غزل کے شروع کرنے کے ساتھ ہی محفل تہ وبالا ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے دوسرا مطلع اک ذرا بتا کے جو گایا، اہل محفل جھومنے لگے۔

نالہ رکنا ہے تو سرگرم جفا ہوتا ہے  
درد تھمتا ہے تو بے درد خفا ہوتا ہے  
اور اس شعر نے تو قیامت ہی برپا کر دی۔

پھر نظر جھینپتی ہے آنکھ جھکی جاتی ہے  
دیکھیے دیکھیے پھر تیر خطا ہوتا ہے  
اس شعر پر یہ حال تھا کہ جس سے نظر ملا کے گایا نظر نہ اٹھا سکا۔  
بت پرستی میں نہ ہوگا کوئی مجھ سے بدنام  
جھینپتا ہوں جو کہیں ذکر خدا ہوتا ہے  
ذرا اس شعر کو سنیے اور قیاس کیجیے عاشق مزاجوں کا اس پر کیا اثر ہوا ہوگا۔

عشق میں حسرت دل کا تو نکلنا کیسا  
دم نکلنے میں بھی کم بخت مزا ہوتا ہے

پھر اس کے بعد یہ شعر

حال دل ان سے نہ کہنا تھا، ہمیں چوک گئے  
اب کوئی بات بنائیں بھی تو کیا ہوتا ہے



تمام محفل وجد کے عالم میں تھی۔ ہر شخص محفوظ تھا۔ ہر لفظ پرواہ ہر سم پر آباہا۔ ایک ایک شعر آٹھ آٹھ دس دس مرتبہ گویا گیا، پھر بھی سیری نہیں ہوتی تھی۔ اس غزل پر میرا بھرا موقوف ہوا۔ دوسرے بھرے میں بھی یہی غزل گوائی گئی۔

مرزا رسوا: وہ خیر محفل کا جو حال ہوا ہوا، از برائے خدا اور جس قدر شعر اس

غزل کے یاد ہوں سنا دیجیے۔ یہ غزل کس کی ہے؟

امراد: اوئی، کیا آپ نہیں جانتے؟

رسوا: میں سمجھا!

امراد: اور شعر سنئے

تالاب گور پہنچ جاتے ہیں مرنے والے

وہ بھی اس وقت کہ جب شوق رسا ہوتا ہے

رسوا: سبحان اللہ!

امراد: واقعی قلم توڑ دیا ہے!

آہ میں کچھ بھی اثر ہو تو شرر بار کہوں

ورنہ شعلہ بھی حقیقت میں ہوا ہوتا ہے

رسوا: یہ بھی خوب کہا ہے!

امراد: اور سنئے

کس قدر معتقد حسن مکافات ہوں میں

دل میں خوش ہوتا ہوں جب رنج سوا ہوتا ہے

رسوا: یہ فلسفہ ہے، اسے وہی خوب سمجھتے ہیں۔

امراد: اور سنئے

شوق اظہار اگر ہے تو مرے دل کو نہ توڑ

اسی آئینے میں تو جلوہ نما ہوتا ہے

رسوا: یہ تصوف ہے، ہم دینا کے لوگ ہیں، ہمیں اس سے کچھ غرض نہیں

مگر شوق اظہار یہ لفظیں کیونکر مل جایا کرتی ہیں؟

مقطع سنئے

امراؤ:

ہجر میں نالہ و فریاد سے باز آ.....

ایسی باتوں سے وہ بے درد خفا ہوتا ہے

مطلع سے مقطع نکال لیا ہے، مقطع کہنے کی فرصت نہ ملی ہوگی۔

رسوا:

فرصت انہیں کب ملتی ہے

امراؤ:

پہلے ہجرے کے دوسرے دن شام کو بوا حسینی میرے کمرے میں آئیں، ایک خدمت گاران

کے ساتھ تھا۔

دیکھو امراؤ صاحب! یہ کیا کہتا ہے۔

بوا حسینی:

اتنا کہہ کے بوا حسینی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

خدمت گار: (سلام کر کے) مجھے نواب سلطان صاحب نے بھیجا ہے، جو کل

شب کو محفل میں زرد مندیل سر پر رکھے دولہا کے داہنی طرف

بیٹھے تھے۔ اور فرمایا ہے کہ میں کسی وقت آپ کے پاس آنا چاہتا

ہوں، بشرطیکہ جس وقت میں آؤں اس وقت کوئی اور نہ ہو۔ اور

اس غزل کی نقل مانگی ہے جو آپ نے کل گائی تھی۔

نواب صاحب کو میری تسلیات کہنا۔ شام کو جب چاہئے

میں:

تشریف لائیے، تخلیہ ہو جائے گا۔ غزل کے لیے کل دن کو کسی

وقت آنا، لکھ دوں گی۔

دوسرے دن پہر دن چڑے خدمت گار آیا۔ میں کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ غزل کی نقل

میں نے کر رکھی تھی اس کے حوالے کی۔ اس نے پانچ اشرفیاں کمرے سے نکال کے مجھے دیں اور کہا کہ

نواب صاحب نے کہا ہے کہ آپ کے لائق تو نہیں مگر خیر پان کھانے کے لیے میری طرف سے

قبول کیجیے۔ آج شب کو چراغ جلنے کے بعد میں ضرور آؤں گا۔ خدمت گار سلام کر کے رخصت

ہوا۔ اس کے جانے کے بعد پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ بوا حسینی کو بلا کے یہ اشرفیاں دے دوں، وہ خانم

کے حوالے کریں۔ پھر ایک دفعہ جو اشرفیوں کی طرف دیکھا، چمکتی چمکتی مئے گھن کی اشرفیاں بھلا

میرے دل سے کب نکلتی تھیں! اس وقت صندوقچہ وندو تچہ تو میرے پاس نہ تھا، پلنگ کے پائے کے نیچے دبا دیں۔

مرزا رسوا صاحب! میرے نزدیک ہر عورت کی زندگی میں ایک وہ زمانہ آتا ہے جب وہ چاہتی ہے کہ اسے کوئی چاہے۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ خواہش چند روزہ ہوتی ہے، بلکہ عنفوان شباب سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور سن کے ساتھ ہی اس کا نشوونما ہوتا رہتا ہے۔ جس قدر سن بڑھتا ہے اسی قدر یہ خواہش بڑھتی رہتی ہے۔

گو ہر مرزا بے شک میرا چاہنے والا موجود تھا، مگر اس کی چاہت اور قسم کی تھی۔ اس کی چاہت میں ایک بات کی کمی تھی جسے میرا دل ڈھونڈتا تھا۔ مردانہ ہمت کو اس کی طینت میں لگاؤ نہ تھا۔ ماں کا ڈومنی پنا اس کے خمیر میں شامل تھا۔ وہ جو کچھ پاتا تھا مجھ سے چھین جھپٹ کے لے لیتا تھا۔ خود ایک روپیہ کے سوا، جس کا ذکر کر چکی ہوں، کبھی کچھ نہیں دیا۔ اب میرا دل ایسا عاشق ڈھونڈتا تھا جو میری ناز برداری کرے، روپیہ خرچے کھلائے پلائے۔ نواب سلطان صاحب (نواب صاحب کا یہی نام آدمی نے بتایا تھا) صورت شکل کے اچھے تھے۔ ان کے چہرے پر اس قسم کا رعب تھا، جس پر عورت ہزاروں سے فریفتہ ہو جاتی ہے۔ بعض لوگ غلطی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ عورت کو صرف خوشامد اور اظہار عشق پسند ہے۔ بے شک پسند ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس میں ذرا بھی کمینہ پن نہ ہو۔ جو لوگ رنڈیوں کا گہنا تاکتے ہوئے آتے ہیں، جن کے ہر کنائے سے یہ مدعا نکلتا ہے کہ ہمیں چاہو، خدا کے لیے چاہو، اور ہمارے گھر بڑ جاؤ، جو کچھ تمہارے پاس ہے، ہمیں دے دو اور ہمارے گھر کی ماما گیری کر دو روٹیاں پکا پکا کے کھلاؤ، ہماری اور ہمارے بال بچوں کی جوتیاں سیدھی کرو۔ ہر شخص کا حسن حضرت یوسف کا معجزہ نہیں ہے کہ ہر ایک عورت اس پر جان دینے لگے۔ مرد عورت سے اور عورت مرد سے محبت کرتی ہے، مگر اس محبت میں اکثر اغراض ذاتی کا بھی لحاظ رہتا ہے۔ بے غرض محبت جیسے لیلیٰ مجنوں شیریں فرہاد، یہ صرف قصے کہانیوں میں سنی جاتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یک طرفہ محبت نہیں ہوتی۔ ہم نے اسے بھی آنکھوں سے دیکھا ہے، مگر اس کو خلل دماغ سمجھنا چاہیے۔ پھر کیا ضروری ہے کہ مرد عورت دونوں دیوانے ہوں۔

دوسرے دن شب کو نواب صاحب تشریف لائے۔ بوا حسینی سے معمولی گفتگو کے بعد تعین اخراجات ہو کر کمرے میں تخلیہ ہو گیا۔ معلوم ہوا نواب صاحب نے ملازم نہیں رکھا، صرف یہ طے ہوا ہے کہ کبھی رات کو گھڑی دو گھڑی کے لیے آیا کریں گے۔ نواب صاحب بہت ہی کم سخن بھولے



آدی تھے۔ سن اٹھارہ انیس برس کا تھا۔ بسم اللہ کے گنبد میں پرورش پائی تھی۔ ماں باپ کے دباؤ میں تھے۔ دنیا کے جعل فریب سے بالکل آگاہ نہ تھے۔ اظہار عشق خدمت گار کی زبانی ہو چکا تھا۔ ورنہ نواب صاحب کو اس میں بھی کسی قدر مشکل ہوتی، مگر میں نے تھوڑی دیر میں بے تکلف بنالیا۔ بہت سی لگاوٹ کی باتیں کیں، بالکل عاشق زار بن گئی۔ اس میں کچھ سچ تھا، کچھ جھوٹ، سچ تو اس لیے تھا کہ نواب صاحب کی صورت ایسی نہ تھی کہ ایک عورت خواہ وہ کیسی ہی سخت دل کیوں نہ ہو ان پر مائل نہ ہو جائے۔ گوری گوری رنگت جیسے گلاب کا پھول، ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، خوبصورت بتیسی، گھونگر والے بال، کتابی چہرہ، اونچا ماتھا، بڑی بڑی آنکھیں، بھرے بھرے بازو، مچھلیاں پڑی ہوئی چوڑی کلاسیاں، بلند بالا کسرتی بدن، خدا نے سر سے لے کے پاؤں تک تمام بدن نور کے سانچے میں ڈھالا تھا، اس پر بھولی بھالی باتیں، بات بات میں عاشقانہ شعر جن میں سے اکثر انہی کی تصنیف تھے۔ شعر پڑھنے میں ہواؤ ٹوٹا ہوا تھا۔ خاندانی شاعر تھے۔ مشاعروں میں اپنے والد کے ساتھ غزل پڑھتے تھے۔ شاعروں کو کیسا ہی عاشقانہ شعر ہو، کسی کے سامنے پڑھتے ہوئے جھینپ نہیں ہوتی۔ خود بزرگ کے سامنے چاہے اور قسم کی گفتگو نہ کر سکتے ہوں، مگر شعر پڑھنے میں تکلف نہیں ہوتا۔ شعر بھی ایسے کہ اگر نثر میں ان کا مطلب ادا کیا جائے تو منہ سے کہتے نہ بنے۔ غرضیکہ اس شب کو بڑے مزے کی صحبت تھی۔

نواب: آپ کی اداؤں نے تو مجھے ایسا فریفتہ کر لیا ہے کہ بغیر آپ کے دیکھے چھین ہی نہیں آتا۔

میں: یہ سب آپ کی قدر دانی ہے، ورنہ میں کیا اور میری حقیقت کیا۔

”ایاز قدر خود شناس۔ من آنم کہ من دانم“

نواب: اوہو! آپ تو خواندہ معلوم ہوتی ہیں۔

میں: جی ہاں، کچھ شد بد پڑھا تو ہے۔

نواب: اور لکھنا بھی جانتی ہو؟

میں: جی ہاں لکھ بھی لیتی ہوں۔

نواب: تو وہ غزل آپ ہی کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہے؟

میں مسکرا کے چپ ہو رہی۔

نواب: واللہ کیا پیارا خط ہے! اس بات سے تو بہت ہی جی خوش ہوا۔



خدمت گاروں سے دل کا حال کہتے نہیں بنتا اب زبان قلم سے  
گفتگو ہوا کرے گی۔ ہم تو ایسا چاہتے ہی تھے جہاں تک ہو کسی  
ایسے معاملے میں غیر کی وساطت نہ ہو۔

نہ غیروں کی وساطت ہو نہ یاروں کی شامت ہو  
جو ہیں آپس کی باتیں راز داران کے ہمیں تم ہو

میں: یہ آپ ہی کا شعر ہے؟

نواب: جی نہیں والد مرحوم نے فرمایا ہے۔

میں: کیا خوب فرمایا ہے!

نواب: ماشاء اللہ آپ کو شاعری کا مذاق بھی ہے۔

اچھی صورت جو خدا دے تو یہ اوصاف بھی دے

حسن تقریر بھی ہو خوبی تحریر بھی ہو

میں: کس کا شعر ہے؟

نواب: ان ہی کا۔

میں: کیا خوب فرمایا!

نواب: وہ ایسا ہی فرماتے تھے مگر واللہ آپ کی شان کے لائق ہے۔

میں:

یہ فقط آپ کی عنایت ہے

ورنہ میں کیا میری حقیقت کیا

نواب: واہ کیا صاف صاف شعر ہے!

میں: تسلیم!

نواب: یہ کہیے آپ شعر بھی کہتی ہیں۔

میں: جی نہیں آپ ایسے قدردانوں سے کہلاتی ہوں۔ اس بات پر

نواب صاحب پہلے تو چپیں بہ جبیں ہوئے پھر مسکرائے اور دیکھ

کر نہیں پڑے۔

نواب: خوب کہی! جی ہاں اکثر رنڈیوں کا دستور ہے کہ یاروں سے شعر  
کہوا کے اپنے نام سے پڑھا کرتی ہیں۔

میں: آپ رنڈیوں کو کہیے۔ کیا مرد ایسا نہیں کرتے؟

نواب: واللہ سچ ہے۔ والد مرحوم کے دوستوں میں اکثر ایسے صاحب

ہیں جنہوں نے کبھی ایک مصرع نہیں کہا اور ہر مشاعرے میں

غزل پڑھنے کو مستعد۔ اکثر والد ہی کہہ دیا کرتے تھے۔ کبھی

ایسا ہوتا تھا کہ میری غزل میں شعر زائد ہوئے چھانٹ دیئے۔

میں کہتا ہوں کہ اس میں لطف ہی کیا ہے۔ والد مرحوم فرمایا

کرتے تھے کہ ہم نے حضرت استاد کے بنائے ہوئے شعر

دیوان سے نکال ڈالے۔ جھوٹی تعریفوں سے دل کو کیا خوشی

ہوتی ہوگی۔

میں: خدا جانے۔ یہ بھی ایک ہوس ہے اور بڑی ہوس۔

نواب: اچھا تو اس غزل کا اور کوئی شعر یاد ہو تو پڑھیے۔

میں:

فرض ہے ضبط نالہ و فریاد

جس سے ناخوش ہو تم وہ عادت کیا

نواب: کیا شعر ہے! پھر پڑھیے۔ واللہ کیا نئی بات کہی ہے!

میں: (شعر دوبارہ پڑھ کے) تسلیم! آپ قدر دانی کرتے ہیں۔

نواب: شعر ہی اچھا ہے۔ اور کوئی شعر پڑھئے۔

میں: اس طرح میں میری غزل نہیں۔ یہ دو شعر ابھی کہے ہیں۔

نواب: یہ اور طرہ ہوا۔ فی البدیہہ اور ایسے شعر! اچھا اور کسی غزل کے

شعر پڑھئے۔

میں: اب آپ ارشاد کیجیے۔ اسی لیے میں نے سبقت کی تھی۔

نواب: میں پڑھے دیتا ہوں مگر آپ کو بھی غزل پڑھنا ہوگی۔

اتنے میں کمرے کا دروازہ دھڑا کے سے کھلا اور ایک صاحب پچاس پچپن برس کا سن سیاہ رنگت، کمر بڑی داڑھی، ترچھی پگڑی باندھے، کمر بندھی ہوئی، کٹار لگی ہوئی، کمرے کے اندر گھس آئے اور آتے ہی نہایت بے تکلفی سے میرا زانو دبا کے بیٹھ گئے۔ نواب صاحب نے میری طرف دیکھا، میں نے سر جھکا لیا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ کہاں تو نواب سے یہ اقرار تھا کہ بالکل تخلیہ ہوگا، کمرے میں کوئی نہ ہوگا۔ کس مزے کی گفتگو، کیسا ستھرا مذاق تھا، کیا راز و نیاز ہو رہا تھا، کہاں یہ بلائے مہیب نازل ہوئی۔ سنگ آمد و سخت آمد۔

ان صاحب نے بیٹھے ہی نواب صاحب کی طرف گھور گھور کے دیکھنا شروع کیا جیسے کوئی اپنے باپ کے قاتل کو دیکھتا ہو۔ گھڑی گھڑی کٹار پر ہاتھ جاتا تھا۔ میں تو دل میں سہمی جاتی تھی۔ یا الہی یہ کیا آفت ناگہانی آگئی۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ نواب اپنی طرف کھنچے ہوئے بیٹھے ہیں، تیوریاں چڑھی ہوئی ہیں۔

ہائے کیا مزے کی صحبت تھی، اس کم بخت نے کیا خلل ڈالا۔ نواب ابھی غزل پڑھنے کو تھے، اس کے بعد میں کچھ کہتی۔ نواب تعریفیں کرتے کیا دل خوش ہوتا۔ آج ہی تو ایک ایسا قدردان ملا تھا جسے مدتوں سے میرا دل ڈھونڈتا تھا اور آج ہی آفت کا سامنا ہوا۔ خدا اس موئے کو جلدی یہاں سے اڑائے۔ یہ خیالات میرے دل میں تھے اور وہ خون خوار صورت آنکھوں کے سامنے تھی جس کے دیکھنے سے میرا دل لرزا جاتا تھا۔ یہ تو میری جان کو گویا دلاور خان ہو گیا۔ بار بار اندیشہ تھا کہ کٹار جو اس کی کمر میں ہے یا میرے کلبجے کے پار ہوگی یا خدا نخواستہ نواب کو کچھ گزند پہنچائے گی۔ دل ہی دل میں کوئی تھمی، خدا غارت کرے، موا کہاں سے اس وقت آ گیا۔

آخر مجھ سے اور تو کچھ نہ بن پڑا، بوا حسینی کو آواز دی۔ انہوں نے آ کے جو یہ ماجرا دیکھا، سمجھ گئی۔ بوا حسینی کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ ان صاحب کو کچھ جانتی بھی تھیں۔

بوا حسینی: خان صاحب! مجھے کچھ آپ سے عرض کرنا ہے، ادھر تشریف لائیے۔

خان صاحب: جو کچھ کہنا ہے وہیں سے کہو، ہم اوگ کہیں بیٹھ کے اٹھتے نہیں۔  
بوا حسینی: تو خان صاحب کوئی زبردستی ہے؟

خان صاحب: اس میں زبردستی کیا۔ رنڈی کے مکان پر کسی کا اجارہ نہیں، اور اگر زبردستی ہے تو زبردستی ہی سہی۔ ہم تو نہیں اٹھنے کے۔ دیکھیں تو

ہمیں کون..... اٹھا دیتا ہے۔

بوا حسینی: اجارہ کیوں نہیں۔ جو زرخرچے گا رنڈی اسی کی ہے۔ پھر اور کوئی اس وقت نہیں آ سکتا۔

خان صاحب: تو کیا زرخرچے کو ہم نابریں؟

بوا حسینی: اچھا اس وقت اس کا کوئی موقع نہیں اور کسی وقت تشریف لائے گا۔

خان صاحب: عورت کچھ داہی ہوئی ہے۔ کہہ دیا ہم نہیں اٹھیں گے۔

میں نے دیکھا کہ نواب صاحب کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا، مگر ابھی تک چپکے بیٹھے ہیں، کچھ منہ سے نہیں بولتے۔

بوا حسینی: بیٹی اچھا تو ادھر اٹھ کے چلی آ۔ نواب صاحب! آپ کے آرام کا وقت ہے۔ کوٹھے پر تشریف لے جائیے۔

میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو اس بگوڑے مارے نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب کیا کروں! نواب: خان صاحب! رنڈی کا ہاتھ چھوڑ دیجیے، اسی میں خیریت ہے۔

بہت کچھ زیادتیاں کر چکے ہیں۔ میں خاموش بیٹھا رہا، صرف اس خیال سے کہ رنڈی کے مکان پر تھک کر نا اچھا نہیں، مگر اب.....

خان صاحب: مگر اب تم کیا کر سکتے ہو۔ دیکھیں تو کون..... رنڈی کا ہاتھ چھڑواتا ہے۔

میں: (زور سے ہاتھ جھٹک کر) اچھا تو ہاتھ چھوڑ دیجیے، میں کہیں جاتی نہیں۔ (واقعی میں نواب صاحب کو چھوڑ کے ہرگز نہ جاتی)۔

خان صاحب نے ہاتھ چھوڑ دیا۔

نواب: میں کہے جاتا ہوں کہ ذرا زبان سنبھال کے گفتگو کیجیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شریفوں کی صحبت نہیں اٹھائی۔

خان صاحب: خیر تم نے تو شریفوں کی صحبت اٹھائی ہے، جو کچھ ہو سکے کر لو۔

نواب: یہ تو معلوم ہوا کہ آپ لڑنے پر آمادہ ہیں، مگر رنڈی کا مکان کوئی



اکھاڑہ نہیں ہے نہ میدان۔ بہتر ہے اس کو کسی اور وقت پر موقوف رکھیے اور اب تشریف لے جائیے۔ نہیں تو.....

خان صاحب: نہیں تو تم مجھے گھول کے پی جاؤ گے؟ تشریف لے جائیے کی خوب کہی تم ہی کیوں نہیں چلے جاتے؟

نواب: خان صاحب! جناب امیر کی قسم! میں بہت طرح دیتا ہوں اس لیے کہ مجھے کسی قدر اپنی عزت کا خیال ہے۔ والدین عزیز دوست جو سنے گا نام رکھے گا ورنہ آپ کو ابھی ان گستاخیوں کا مزا چکھا دیتا۔ پھر میں آپ سے کہتا ہوں کہ بے فائدہ جھٹ نہ کیجیے تشریف لے جائیے۔

خان صاحب: رنڈی کے گھر پر تو آتے ہو اور اماں جان سے ڈرتے ہو؟ گستاخیاں کیسی؟ تمہارے باپ کا نوکر ہوں؟ تم اپنے گھر کے رئیس زادے ہو تو ہوا کرو۔ رنڈی کے مکان پر تم بیٹھے ہو ہم بھی بیٹھے ہیں۔ جب ہمارا جی چاہے گا جائیں گے۔ تم خود بے کار جھٹ کرتے ہو۔ کسی کو اٹھاتے نہیں دیکھا۔

نواب: اٹھا دینا تو کوئی مشکل کام نہیں۔ خدمت گاروں کو آواز دیتا ہوں تو آپ کی گردن میں ہاتھ دے کے ابھی نکالے دیتے ہیں۔

خان صاحب: خدمت گاروں کے بل پر نہ بھولنا یہ کٹار بھی دیکھی ہے؟

نواب: ایسے بہت کٹار دیکھے ہیں۔ جو وقت پر کام آوے وہ کٹار ہے۔

آپ کی کٹار میان سے نکلتی رہے گی یہاں تو ابھی آپ کی گردن ناپ دی جائے گی۔ پھر دیکھا جائے گا۔

خان صاحب: بے اب تمہی گھر کو جاؤ اماں جان یاد کرتی ہوں گی۔

میں دیکھ رہی تھی کہ نواب صاحب کا چہرہ بالکل متغیر ہو گیا ہے۔ مارے غصے کے تھر تھر کانپ رہے تھے مگر داہری شرافت! اس پاجی نے کس قدر سخت سست کہا مگر یہ آپ ہی آپ کر کے بات کر رہے ہیں۔ اس سے مجھے پہلے تو یہ خیال تھا کہ نواب ڈر گئے مگر میرا یہ خیال غلط نکلا۔ واقعی نواب کو اپنی عزت کا خیال تھا اسی لیے طرح دے رہے تھے۔ جانتے تھے کہ معاملہ سہولت سے

رفع دفع ہو جائے مگر اس پاجی کی بدزبانی بڑھتی جاتی تھی۔ جس قدر نواب طرح دیتے تھے وہ اور شیر ہو جاتا تھا۔ آخر نواب نے کہا۔

نواب: اچھا اٹھئے خان صاحب! ہم آپ دونوں یہاں سے چلے چلیں، عیش باغ میں چل کے ہمارے آپ کے دودو ہاتھ ہو جائیں۔

خان صاحب: (تہقہہ مار کے) صاحب زادے! ابھی تم خود منہ چومنے کے لائق ہو اور مردوں سے خانہ جنگی کرنے کا حوصلہ! کہیں کوئی چرکا کھا جاؤ گے تو اماں جان روتی پھریں گی۔

نواب: مردود! اب تیری بدزبانی حد کو پہنچ گئی ہیں۔ دیکھ اب تجھے تیری گستاخی کی سزا دیتا ہوں۔

یہ کہتے ہی نواب نے دولائی کے اندر سے ہاتھ نکالا۔ ہاتھ میں طمنچہ تھا، دن سے داغ دیا۔ خان صاحب دھم سے گر پڑے، میں سن سی ہو گئی۔ فرش پر خون ہی خون نظر آتا تھا۔ بوا حسینی جہاں کھڑی تھیں کھڑی رہ گئیں۔ طمنچے کی آواز سن کے خانم صاحب، مرزا صاحب، میر صاحب، خورشید جان، امیر جان، بسم اللہ جان، خدمت گار، مہریاں، تو، میں سب دوڑے آئے۔ میرے کمرے میں بھیڑ ہو گئی۔ سب اپنی اپنی کہنے لگے۔ اتنے میں شمشیر خاں (ایک ادھیڑ سا آدمی، نواب صاحب کا ملازم) نے لپک کر نواب کے ہاتھ سے طمنچہ لیا اور کہا ”لے اب حضور گھر تشریف لے جائیں، میں سمجھ لوں گا۔“ منبرہاں

نواب: میں نہیں جاتا۔ اب جو کچھ ہوا، ہوا اور جو کچھ ہونا ہوگا ہو جائے گا۔

شمشیر خاں: (کمر سے چھری نکال کے) جناب امیر علیہ السلام کی قسم! ابھی اپنے کلیجے میں مار لوں گا، نہیں تو برائے خدا آپ چلے جائیں۔ آپ کا یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں ہے۔

اتنے میں لوگوں نے دیکھا خان صاحب کے گولی کہاں لگی۔ معلوم ہوا کہ جان کی خیریت ہے، بازو میں لگی تھی اس پار ہو گئی۔

شمشیر خاں: میں عرض کرتا ہوں کہ حضور تشریف لے جائیں۔ اس مردود کا ہوا ہی کیا ہے۔ آپ کیوں بدنام ہوتے ہیں۔

بارے نواب صاحب بھی کچھ سمجھ کے اٹھے۔ ایک آدمی ہمارے یہاں سے ساتھ کیا گیا۔ خانم نے اسی وقت مرزا علی رضا بیگ کے بلوا بھیجا۔ وہ چوک میں ہی تھے۔ فوراً چلے آئے۔ خانم نے علیحدہ لے جا کر نہیں معلوم کیا کان میں پھونکا وہاں سے آئے تو یہ کہتے ہوئے آئے مرزا: ہوگا! پھینک دو مرد کو کمرے کے نیچے سمجھ لیا جائے گا۔

خیر خان صاحب کو کمرے کے نیچے تو نہیں پھینکا بازو پر پٹی باندھی ڈولی بلوائی گئی۔ خان صاحب کو بھی کسی قدر ہوش آ گیا تھا۔ مکان کا پتا پوچھا، معلوم ہوا مرغ خانے میں رہتے ہیں۔ ڈولی میں بٹھا کے ان کے گھر بھجوا دیا۔ کہاروں کو سمجھا دیا تھا مکان کے قریب کہیں پر اتار کے چلے آنا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

سلطان صاحب کئی دن تک نہیں آئے نہ ان کا آدمی آیا۔ مجھے ان سے محبت سی ہو گئی تھی۔ یقین تھا کہ وہ اب نہیں آئیں گے اور واقعی ایسا ہی ہوا بھی۔ وضع دار آدمی تھے پہلے ہی جب وہ آئے تھے آدمی کی زبانی پیش تر بہت تاکید تھیلے کے لیے کر دی تھی۔ بوا حسینی نے اقرار کر لیا تھا کہ کوئی نہ آنے پائے گا۔ مگر اتنی چوک ہو گئی کہ دروازے پر کسی کو نہ بٹھا دیا۔ خان صاحب از غیبی ڈھیلا خدا جانے کہاں سے آن پڑے سارا کھیل بگڑ گیا۔ اتفاق سے چار پانچ دن کے بعد ایک برات میں میرا مجرا آ گیا تھا۔ وہاں نواب صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ میرا پہلا مجرا نو بجے رات کو شروع ہونا تھا۔ محفل میں بات کرنا کیسا اشارے کنائے کا بھی موقع نہ تھا۔ ایک لڑکا گورا گورا کوئی نو دس برس کا سن بھاری کپڑے پہنے سلطان صاحب کے پاس بیٹھا تھا، کسی ضرورت سے اٹھا۔ میرا مجرا ہو چکا تھا، علیحدہ کمرے میں پیشوازا اتار رہی تھی۔ میں نے اسے اشارے سے بلوایا، پاس بٹھایا، ایک پان لگا کے دیا، پوچھا۔

میں: سلطان صاحب کو جانتے ہو؟

لڑکا: کون سلطان صاحب؟

میں: وہ جو دنہا کے پاس تمہارے برابر بیٹھے تھے۔

لڑکا: (تیوری چڑھا کے) واہ! وہ ہمارے بڑے بھائی ہیں، انہیں ذرا

سلطان صاحب نہ کہنا۔

میں: اچھا تو ہم کچھ دیں، انہیں دو مگے؟

لڑکا: کہیں مجھ پر خفا نہ ہوں؟



میں: خفا نہیں ہوں گے۔  
 لڑکا: اور دو گی کیا پان؟  
 میں: پان نہیں پان تو ان کے خاص دان میں ہوں گے۔ اے لڑیہ کاغذ  
 دے دینا۔ ایک پر چہ کاغذ کا کمرے میں فرش پر پڑا تھا میں نے  
 اس پر کونسلے سے یہ شعر لکھ دیا۔

مدتوں سے ہم ہیں محروم عتاب  
 بزم میں آج ان کو چھیڑا چاہیے  
 اور سمجھا دیا کہ یہ کاغذ ان کی آنکھ بچا کے سامنے رکھ دینا ان کو معلوم بھی نہ ہوگا۔ لڑکے نے  
 ایسا ہی کیا۔ میں کمرے کے پٹ کی آڑ سے جھانک رہی تھی۔ سلطان صاحب نے وہ کاغذ اٹھایا  
 پڑھا۔ پہلے تو چہرے پر کچھ فکر کے آثار ظاہر ہوئے۔ پھر تھوڑی دیر تک پرچے کو غور سے دیکھتے  
 رہے۔ اس کے بعد مسکرا کے جیب میں رکھ لیا۔ شمشیر خان کو اشارے سے بلایا اس کے کان میں  
 کچھ چپکے سے کہا، کوئی گھنٹہ بھر کے بعد شمشیر خاں ہمارے کمرے میں آیا۔  
 شمشیر خان: نواب صاحب نے کہا ہے کہ اس پرچے کا جواب ہم گھر پر جا کر  
 لکھ بھیجیں گے۔

دوسرا مجرا صبح کو ہوا تھا اس وقت سلطان صاحب محفل میں نہ تھے۔ ان کے بغیر محفل مجھے  
 سونی معلوم ہوتی تھی گانے میں دل نہ لگتا تھا۔ آخر جوں توں مجرا ختم ہوا میں گھر آئی۔ اس دن  
 دن بھر شمشیر خان کا انتظار رہا۔ بارے چراغ جلنے کے بعد وہ آیا، نواب کا رقعہ دیا۔ مضمون یہ تھا۔  
 ”تمہارے شعر نے اس آگ کو جو میرے دل میں دبی ہوئی تھی، کرید کر بھڑکا دیا، واقعی مجھے  
 تم سے محبت ہے، مگر اپنی وضع سے مجبور ہوں۔ تمہارے مکان پر اب ہرگز نہ آؤں گا۔ میرے ایک  
 بے تکلف دوست نواز گنج میں رہتے ہیں، کل میں تمہیں وہاں بلوا بھیجوں گا، بہ شرط فرصت چلی آتا۔  
 یہی ایک صورت ملنے کی ہے، وہ بھی نو دس بجے رات تک۔“

شب وصال کی کوتاہیوں کا شکوہ کیا  
 یہاں تو ایک نظر دیکھنے کے لالے ہیں  
 سلطان صاحب اس دن سے کبھی خانم کے مکان پر نہیں آئے۔ ہفتے میں دو تین مرتبہ نواز گنج



میں نواب بنے خاں کے مکان پر بلوا بھیجتے تھے۔ عجب لطف کی صحبت رہتی تھی۔ کبھی شعر و سخن کا چرچا ہوا، کبھی نواب نے صاحبِ طبلہ بجانے لگے، میں گانے لگی۔ سلطان صاحبِ خود بھی گاتے تھے۔ تال سم سے تو ایسے واقف نہ تھے مگر اپنی غزل آپ خوب گالیتے تھے۔

کچھ اس طرح سے نظر باز یوں کی مشق بڑھی

میں ان کو اور وہ میری نظر کو دیکھتے ہیں

جب یاد آتا ہے اس جلسے کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ گرمیوں کے دن شبِ مہتاب کا عالم، صحنِ باغ میں تختوں کے چوکے پر سفید چاندنی کا فرش ہے، گاؤں تھکے لگے ہوئے۔ سامانِ عیش و نشاط مہیا، باغ میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے، نیلے چنبیلی کی مہک سے دماغ معطر، خوشبودار گلوریاں بے ہوئے حقے، تھلیے کا جلسہ آپس کی چہلیں، بے تکلفی کی باتیں! ایسے ہی جلسوں میں بیٹھ کر دنیا و مافیہا کا تو ذکر کیا، انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے اور اسی کی سزا ہے کہ ایسے جلسے بہت جلد برہم ہو جاتے ہیں اور ان کا افسوس مرتے دم تک رہتا ہے، بلکہ شاید مرنے کے بعد بھی۔

لذتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ

خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

واقعی سلطان صاحب کو مجھ سے اور مجھے ان سے محبت تھی۔ دونوں کے مذاق کچھ ایسے سننے ہوئے تھے کہ عمر بھر کا ساتھ ہوتا تو کبھی ملال نہ ہوتا۔ سلطان صاحب کو شعر و سخن کا شوق تھا اور مجھے بھی بچپن سے اس کی لت ہے۔ سلطان صاحب سے جیسا مرادل ملا اور کسی سے نہیں ملا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسی سبب سے مجھ سے محبت کرتے تھے۔ بات بات میں وہ شعر پڑھتے تھے۔ میں جواب دیتی تھی۔ مگر افسوس! فلک تفرقہ انداز نے وہ جلسہ بہت ہی جلد برہم کر دیا۔

دل یہ کہتا ہے فراقِ ماہِ وانجم دیکھ کر

ہائے کیا کیا صحبتیں راتوں کی برہم ہو گئیں

رسوا: اچھا وہ سب کچھ تو ہوا۔ آپ کے قدم کی برکت سے ایسے ایسے

بہت سے جلسے برہم ہو گئے ہوں گے۔

امراؤ: واہ مرزا صاحب! تو کیا میرے دشمن بھن پیرے ہیں، یہ آپ

نے خوب کہی۔

رسوا: یہ تو میں نہیں کہہ سکتا، مگر سلامتی سے جہاں آپ تشریف لے گئیں، صفائی ہو گئی۔

امراؤ: آپ جو چاہے کہیے۔ اگر ایسا جانتی کہ آپ یہ کہیں گے تو اپنی رو داد ہرگز بیان نہ کرتی۔ خیر اب تو قصور ہوا۔

رسوا: قصور! یہی تو آپ نے زندگی بھر میں ایک کام کیا جس سے آپ کا نام دنیا میں رہ جائے گا۔ خواہ نیک نامی کے ساتھ خواہ بدنامی کے ساتھ۔ اس کا ذمہ میں نہیں کرتا۔ اب اس بات کو یہیں تک رہنے دیجیے۔ ذرا اس غزل کے دو تین شعر اور یاد ہوں تو پڑھ دیجیے۔

امراؤ: آپ بھی آدمی کو خوب بناتے ہیں۔

رسوا: خیر، بگاڑتا تو نہیں؟ اچھا آپ شعر پڑھیے۔

امراؤ: اچھا سنئے۔ ایک مطلع اور دو شعر اور یاد ہیں۔

درد دل کی لذتیں صرف شب غم ہو گئیں

طولِ فرقت سے بہت بے تابیاں کم ہو گئیں

وہ جو بیٹھے سوگ میں زلف رسا کھولے ہوئے

حسرتیں میری شریکِ بزمِ ماتم ہو گئیں

ہم نشین! دیکھی شجوت داستاں ہجر کی

صحبتیں جمنے نہ پائی تھیں کہ برہم ہو گئیں

اسی زمانے میں نواب جعفر علی خان صاحب کی ملازم ہوئی۔ سن شریف کوئی ستر برس کے قریب تھا۔ منہ میں ایک دانت نہ تھا، پشت خم ہو گئی تھی۔ سر میں ایک بال سیاہ نہ تھا، مگر اب تک اپنے کو پیار کرنے کے لائق سمجھتے تھے۔ ہائے وہ ان کا کچلی انگرکھا اور گلبدن کا پا جامہ، لال نیفہ، مصالح دار ٹوپی، کاکلیں بٹی ہوئی، عمر بھر نہ بھولیں گی۔

آپ کہئے گا کہ اس عمر اور ایسی حالت میں رٹھی نوکر رکھنا کیا ضروری تھا۔ سنئے مرزا

صاحب! اس زمانے کا فیشن یہی تھا۔ کوئی امیر رئیس ایسا بھی ہوگا جس کے پاس رنڈی نہ ہو۔ نواب صاحب کی سرکار میں جہاں اور سامان شان و شوکت کے تھے وہاں سلامتی منانے کے لیے جلوسیوں میں ایک رنڈی کا بھی اسم تھا۔ پچھتر روپے ماہوار ملتے تھے۔ دو گھنٹے کے لیے مصاحبت کر کے چلی آتی تھی۔ اور تکلف سنئے نواب بوڑھے ہو گئے تھے مگر کیا مجال نوبے کے بعد دیوان خانے میں بیٹھ سکیں۔ اگر کسی دن اتفاق سے دیر ہو گئی کھلائی آ کے زبردستی اٹھالے جاتی تھی۔ نواب صاحب کی والدہ زندہ تھیں ان سے اسی طرح ڈرتے تھے جس طرح پانچ برس کا بچہ ڈرتا ہو۔ بیوی سے بھی انتہا کی محبت تھی۔ بچپن میں شادی ہوئی تھی مگر سوائے عشرہ محرم اور شبوں کے کسی دن علیحدہ سونے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ آپ تو ہنستے ہوں گے۔ مگر میرے دل سے پوچھیے بے شک پیار کرنے کے قابل تھے۔ اس بڑھاپے میں جس وقت سوز پڑھتے تھے دل لوٹ جاتا تھا۔ فن موسیقی میں ان کو کمال تھا۔ کیا مجال ان کے سامنے کوئی گا سکے۔ اچھے اچھے گویوں کو ٹوک دیا۔ سوز خوانی میں یکتا تھے سندی سوز میر علی صاحب کے ان کو پہنچے ہوئے تھے۔ ان کی ملازمت سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ سینکڑوں سوز یاد ہو گئے دور دور میری شہرت ہو گئی۔

خانم کی تعز یہ داری تمام شہر کی رنڈیوں سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ امام باڑے میں پٹکے شیشے آلات جو شے تھی نادر تھی۔ عشرہ محرم میں دس دن تک روز مجلس ہوتی تھی۔ عاشورے کے دن سینکڑوں محتاج مومنین کی فاقہ شکنی کی جاتی تھی۔ چہلم تک ہر جمعرات کو مجلس ہوتی تھی۔

میری سوز خوانی مشہور تھی۔ ایسی ترکیبیں اور کسی کو کب یاد تھیں۔ بڑے بڑے سوز خواں میرے سامنے منہ نہ کھول سکتے تھے۔ اسی سوز خوانی کی بدولت نواب ملکہ کشور کے محل تک میری رسائی ہوئی۔ جہاں پناہ نے خود میری نوحہ خوانی کی تعریف کی۔ سرکار شاہی سے مجھ کو بہت کچھ ہر محرم میں عطا ہوتا تھا۔ مرثیہ خوانوں میں میرا اسم تھا۔ شب کو اپنے امام باڑے میں ماتم کر کے مجھے در دولت پر حاضر ہونا پڑتا تھا۔ کوئی دو بجے رات کو وہاں سے آتی تھی۔

جس زمانے میں بسم اللہ کی مسی ہوئی تھی نواب چھبھن صاحب کے چچا کر بلائے معلیٰ گئے ہوئے تھے۔ بسم اللہ کی مسی کو کوئی چھ مہینے گزرے ہوں گے کہ وہ کر بلا سے تشریف لائے۔ ان کی لڑکی کی نواب کے ساتھ منگنی ہو گئی تھی۔ انہوں نے آتے کے ساتھ ہی شادی پر زور دیا۔ نواب صاحب بسم اللہ جان پر مرتے تھے۔ ادھر بسم اللہ جان نے گھر میں بیٹھ جانے کا فقرہ دے رکھا تھا صاف انکار کر دیا۔ مگر انکار کب چلتا تھا۔ شاہی زمانہ ان کی لڑکی پر گالی چڑھ چکی تھی وہ کب مانتے



- ایک شب کو نواب کے مکان پر جلسہ ہے۔ مصاحبین جمع ہیں۔ بسم اللہ نواب کے پہلو میں بیٹھی ہیں اس رات کو بسم اللہ کے ساتھ میں بھی چلی گئی تھی۔

سامنے بیٹھی ہوئی گارہی ہوں، نواب صاحب ظہورہ چھٹھر رہے ہیں۔ نواب صاحب کے مصاحب خاص دلبر حسین طبلہ بجا رہے ہیں۔ اتنے میں ایک خبردار نے خبر دی کہ بڑے نواب صاحب (نواب صاحب کے چچا) تشریف لاتے ہیں۔ نواب صاحب یہ سمجھے کہ آئے ہیں تو اندر محل میں بیگم صاحب (نواب صاحب کی والدہ) کے پاس جائیں گے۔ ہم سب کو بھی یہی خیال تھا۔ مگر وہ دراناد یوان خانے میں گھسے چلے آئے۔ آ کے جوہر دکھا تو یہ جلسہ ہے۔ آگ بگولہ ہو گئے۔ خیران کے آنے کے ساتھ ہی گانا تو موقوف ہوا، نواب صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

بڑے نواب: خیراب تعظیم و تکریم کو تو رہنے دیجیے مجھے ایک امر ضروری عرض کرنا تھا، ورنہ آپ کے عیش میں خلل امداز نہ ہوتا۔

نواب: ارشاد!

بڑے نواب: آپ بچے ہیں، آپ کو معلوم نہیں میرے چھوٹے بھائی احمد علی خان مرحوم نے والدہ مرحومہ کے سامنے انتقال کیا تھا، اس وجہ سے آپ محبوب الارث ہیں۔ کوئی حق آپ کا اس جائیداد میں نہیں ہے جس پر آپ قابض و متصرف ہیں۔ بے شک والدہ مرحومہ نے آپ کو بیٹا کیا تھا اور مرتے وقت آپ کے نام وصیت بھی کر گئی ہیں، مگر وہ کوئی چیز نہیں۔ صرف ایک ٹکٹ جائیداد بنا، اس وصیت نامے کے آپ کو مل سکتی ہے، مگر لوگوں کے کہنے سننے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک ٹکٹ سے زیادہ صرف کر چکے ہیں۔ خیر ٹکٹ کا نبھ کو دعویٰ نہیں اور ٹکٹ سے زیادہ نسبت آپ سے باز پرس نہ کی جائے گی اس لیے کہ آپ میرے خون جگر ہیں۔ (اس کے بعد بڑے نواب صاحب آب دیدہ ہو گئے، مگر پھر ضبط کر کے کہا) آپ اس جائیداد پر مدت العمر قابض و متصرف رہتے، میری ذاتی جائیداد میرے خرچ کے لیے کفالت کرتی ہے اور اس جائیداد کے بھی آپ ہی وارث



ہوتے۔ مگر آپ کی بد وضعی نے مجھے مجبور کیا کہ آپ کو اس جائیداد موروٹی سے بے دخل کر دوں۔ بزرگوں کی نیک کمائی حرام کاری میں مٹانے کے لیے نہیں ہے۔ منصف الدولہ کے آدمی میرے ہم راہ ہیں اسی وقت تمام گھر کا تعلیقہ ہوگا۔ آپ فوراً مع ارباب نشاط یہاں سے تشریف لے جائیے۔

نواب: تو اس جائیداد میں میرا کوئی حق نہیں؟

بڑے نواب: جی نہیں۔

نواب: اچھا ایک ٹلٹ پانے کا مستحق ہوں؟

بڑے نواب: وہ آپ لے چکے اور آپ کو کچھ دعویٰ ہے تو در دولت پر تشریف لے چلیے میرے نزدیک آپ کا ایک حصہ نہیں۔

نواب: تو اچھا اماں جان کو میں اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا۔

بڑے نواب: وہ آپ سے دست بردار ہوتی ہیں۔ وہ میرے ساتھ کربلا جائیں گی۔

نواب: اچھا تو میں کہاں جاؤں؟

بڑے نواب: یہ میں کیا جانوں! یہ اپنے مصاحبین اور ملازمین مشغولہ اور معشوقہ سے دریافت کیجیے۔

نواب: اچھا تو میرے کپڑے اسباب وغیرہ تو دے دیجیے۔

بڑے نواب: اس مکان میں آپ کا کوئی اسباب نہیں ہے۔ نہ آپ کے بنوائے ہوئے کپڑے ہیں۔

اس کے بعد منصف الدولہ کے آدمی دیوان خانے میں آئے نواب صاحب کو مع مصاحبین وارباب نشاط گھر سے باہر کیا۔

ہم لوگوں نے گھر سے نکلتے ہی ڈولیاں کرایہ کیں چوک کا راستہ لیا مصاحبین اور نواب صاحب خدا جانے کہاں گئے۔

سننا ہے کہ مصاحبین ایک ایک کر کے راستے ہی سے رخصت ہو گئے۔ نواب کے والد کا ایک قدیم ملازم مخدوم بخش جس کو نواب صاحب نے بیکار سمجھ کر نوکری سے برطرف کر دیا تھا راستے میں

ملا۔ اس نے حال دریافت کیا اور ان کی بے کسی پر ترس کھا کے اپنے گھر لے آیا۔

نواب صاحب کے گھر سے آنے کے بعد بسم اللہ کے کمرے میں جلسہ ہے۔ میاں حسو، نواب صاحب کے خاص کارکن، مصاحب، دوست، جاں نثار، جہاں نواب کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے والے تشریف رکھتے ہیں۔ یہ آج ہی کچھ نہیں آئے ہیں، پہلے بھی نواب کے چوری چھپے آیا کرتے تھے مگر آج کھلے خزانے بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھے ہیں۔ اس وقت آپ بسم اللہ جان پر گویا بے شرکت احدے دے مزاحمت غیرے قابض و متصرف ہیں۔ نوکری کی گفتگو ہو ہی ہے۔

حسو: دیکھو بسم اللہ جان!..... نواب سے تو اب سے کوئی امید نہ رکھو۔

میں جو کچھ کہو وہ دے دیا کروں، غریب آدمی ہوں، زیادہ تو میری اوقات نہیں۔ جو نواب صاحب دیتے تھے اس کا نصف بھی مجھ سے ممکن نہیں، مگر ہاں کسی نہ کسی طرح آپ کو خوش رکھوں گا۔

بسم اللہ: غریب آدمی ہوں؟ یہ نہیں کہتے کہ نواب کی دولت کاٹ کاٹ کے گھر میں بھر لی اور پھر ہم سے غریبی بیان ہوتی ہے۔ ایسے غریبوں کو تاؤ تو نو من چربی سے کم نہ نکلے۔

حسو: ہیں ہیں! تم تو ایسا نہ کہو۔ وہ نواب کے پاس تھا ہی کیا جو میں گھر بھر لیتا۔ کیا میری والدہ صاحبہ کے پاس کچھ کم تھا؟

بسم اللہ: آپ کی والدہ بوا فرخندہ نواب سرفراز محل کی خاصہ والیوں میں تھیں نا؟

میر حسو: (جھینپ کر) وہ جو کوئی ہو، جب مری ہیں تو کوئی چار ہزار کا تو زیور چھوڑ کر مری ہیں۔

بسم اللہ: وہ آپ کی بیوی لے کے یار کے ساتھ نکل گئیں۔ آپ کے پلے کیا پڑا؟ میرے آگے ذرا شیخی نہ بگھاریے، مجھے رتی رتی آپ کا حال معلوم ہے۔

حسو: تو والد کے پاس کچھ کم تھا؟

بسم اللہ: والد آپ کے نواب حسن علی خان کے چڑی ماروں میں تھے۔

چڑی بازوں میں؟

حسنو:

اچھا وہ مرغ بازوں میں بھی۔

بسم اللہ:

مرغ بازوں میں تھے؟

حسنو:

اچھا وہ شیر باز بھی تھا تو چڑیا کا کام۔

بسم اللہ:

لیجیے آپ تو مذاق کرتی ہیں۔

حسنو:

میں کھری کہتی ہوں اسی سے بری مشہور ہوں۔ اور کہتی بھی نہ

بسم اللہ:

تمہارے پیچھے پھورے پن پر جی جل گیا۔ یوں تو آتے تھے میں

نے کبھی منع نہیں کیا۔ آج ہی تو نواب پر یہ واردات ہوئی آج

ہی آپ نے میرے منہ در منہ نوکری کا پیغام دے دیا۔ ہوش

کی دوا کرو۔ تم کیا نوکر رکھو گے۔ یہی ایک مہینہ دو مہینہ تین مہینہ

سہی بس!

چھ مہینے کی تنخواہ جمع کر دوں؟

حسنو:

زبان سے؟

بسم اللہ:

یہ لو (سونے کے جڑاؤ کڑے کی جوڑی کمر سے نکال کے)

حسنو:

تمہارے نزدیک کتنے کا مال ہوگا؟

میں دیکھوں؟ (کڑے حسنو کے ہاتھ سے لے کے اپنے ہاتھوں

بسم اللہ:

میں پہن لیے) کل چھنٹا مل کے لڑکے کو دکھاؤں گی مگر بنے

اچھے ہیں۔ اچھا تو اب آپ تشریف لے جائیے۔ اس وقت تو

مجھے چھٹن باجی نے بلا بھیجا ہے ٹھہر نہیں سکتی کل اسی وقت

آئیے۔

تو کڑے اتار دیجیے۔

حسنو:

یا اللہ! کوئی چوروں سے بہوار ہے؟ میں تمہارے کڑے کچھ کھا

بسم اللہ:

نہ لوں گی۔ اس وقت میرے ہاتھ میں سادی پڑیاں پڑی ہوئی

ہیں۔ اماں جان سے چھپ کے جاتی ہوں ان سے کڑے

مانگوں گی تو کہیں گی کیا کرو گی اس لیے ذرا ہاتھ میں ڈال لیے

صبح کو لے جانا۔

حسرو: کڑے دے دیجئے میرے نہیں ہیں، تو کیا بات تھی تم پر سے صدقے کیے تھے۔

بسم اللہ: تو کیا آپ کی اماں کے ہیں؟ انہوں نے انتقال کیا پھر بھی آپ کا مال ہے۔

حسرو: میں نے یوں ہی تمہیں دکھا دیئے تھے میرا مال نہیں ہے۔

بسم اللہ: جیسے میں پہچانتی نہیں۔ یہ وہی کڑے ہیں جو نواب نے اس دن میرے سامنے گردی رکھنے کو دیئے تھے۔

حسرو: لو اور سنو! یہ کب؟

بسم اللہ: یہ جب کہ جس دن بہن امر او کے بحرے کی فرمائش ہوئی تھی۔ بہن امر او نے ضد کی کہ میں پورے سولوں گی۔ نواب کے پاس خرچ نہ تھا میرے سامنے صندوقچہ نکال کے کڑے پھینک دیئے تھے۔ (پھر میری طرف مخاطب ہو کے) دیکھنا بہن امر او یہ وہی کڑے ہیں نا؟

میں: مجھ سے کیا پوچھتی ہو، کیا تم جھوٹ کہو گی۔

بسم اللہ: لے خشکا کھائیے۔ اب یہ کڑے آپ کو نہ دیئے جائیں گے۔ یہ ہمارے نواب کے کڑے ہیں۔ ہم نے پہچانے۔ اب ہم نہ دیں گے۔

حسرو: لو اچھی کہی! اور وہ روپے جو ہم نے دیئے ہیں؟

بسم اللہ: روپے تم کہاں سے لائے؟ وہ بھی نواب کا مال تھا۔

حسرو: جی سچ! مہاجن سے بیازو (سودی) نہ لا کے دیئے تھے؟

بسم اللہ: اچھا تو مہاجن کو بھیج دیجئے ہم اس کو روپے دے دیں گے آپ ٹہلیے۔

حسرو: کڑے تو میں لے کے جاؤں گا۔

بسم اللہ: میں تو نہ دوں گی۔



حسود: تو کچھ زبردستی ہے؟

بسم اللہ: جی ہاں زبردستی ہے۔ لے اب چپکے سے کھسک جائیے، نہیں

تو.....

حسود: اچھا تو رہنے دیجیے، کل ہی دے دیجیے گا۔

بسم اللہ: کل دیکھا جائے گا۔

”دیکھا جائے گا“ بسم اللہ نے اس تیور سے کہا کہ میاں حسود کو چپکے سے اٹھ کے چلے جاتے ہی بن پڑی۔ بات یہ تھی کہ نواب صاحب کے چچا نے جب چھبھن صاحب کے نوکروں سے حساب فہمی کی ہے اس وقت جس قدر اسباب جس جس کی معرفت دیا تھا، اس کو سود اور اصل کے روپے دے کے چھڑا لیا۔ حسود سے اس کڑے کی جوڑی کے لیے جب باز پرس کی گئی تو صاف مکر گیا کہ میری معرفت گروی نہیں ہوئے۔ اسی سے میاں حسود کی کور دیتی تھی۔

بسم اللہ: (حسود کے چلے جانے کے بعد مجھ سے) دیکھا بہن! یہ بڑا قابو

چی ہے۔ نواب کا گھر اسی موزی نے تہس نہس کیا ہے۔ میں

مدت سے اس موئے کی تاک میں تھی۔ آج ہی تو داؤں پر چڑھا

ہے۔ یہ کڑے میں اس کو کب دیتی ہوں۔ کر ہی کیا سکتا ہے۔

چوری کا تو مال ہے۔

میں: ہر گز نہ دینا۔ دینا ہے تو نواب کو دے دو احسان ہوگا۔

بسم اللہ: نواب کو بھی نہ دوں گی۔ بہن گیارہ سو کی جوڑی ہے، موئے نے

سودا و سود روپے پر ہتھیالی تھی، زیادہ بریں نیست۔ سودا و سودا والے

کردوں گی۔ دس بیس سود کے سہی۔

میں: بھلا مہاجن تمہیں کیوں دینے لگا؟

بسم اللہ: کیسا مہاجن! اسی نے روپے دیئے تھے اور جب بڑے نواب

نے پوچھا کیسا مکر گیا۔ اگر یہ کچھ زیادہ تر پھس کریں گے تو ان کو

کو توالی کا چبوترہ دکھاؤں گی۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ نواب صاحب تشریف لائے۔ پا پیادہ اکیلے چہرے پر ادا سی چھائی ہو آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے۔ نہ وہ شان و شوکت، نہ وہ رعب و اب، نہ وہ بے تکلفی۔

چپکے آ کے اک کنارے بیٹھ رہے۔ سچ کہوں، میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، مگر میں نے اپنے کو روکا۔ مگر واہ ری بسم اللہ! رنڈی ہو تو ایسی ہو۔ آتے کے ساتھ ہی کڑوں کا قصہ چھیڑ دیا۔

بسم اللہ: نواب! دیکھو یہ وہی کڑے کی جوڑی ہے نا جو تم نے اس دن حسد کو گروی کرنے کو دی تھی؟

نواب: وہی ہیں۔ وہ تو مکر گیا تھا کہ میرے ہاتھوں گروی ہی نہیں ہوئے؟

بسم اللہ: کتنے پر گروی ہوئے تھے؟

نواب: یہ تو یاد نہیں، شاید ڈھائی سو یا سوا دس سو، کچھ ایسے ہی تھے۔

بسم اللہ: اور سود کیا تھا؟

نواب: سود کا حساب کس نے آج تک کیا۔ جو چیز گروی ہوئی، پھر اس کے چھڑانے کی نوبت نہیں آئی سود کا حساب کیا ہوتا۔

بسم اللہ: اچھا تو یہ کڑے میں لے لوں؟

نواب: لے لو۔

بسم اللہ: کہو تو میاں حسد کو مرزا صاحب کے پاس بھیجوں؟

نواب: نہیں؟ میرے سر کی قسم! ایسا نہ کرنا، سید ہے۔

بسم اللہ: سید ہے؟ اس کے باپ کا پتا نہیں؟

نواب: خیر وہ تو اپنے منہ سے کہتا ہے۔

میں اپنے دل میں نواب کی ہمت پر آفرین کرنے لگی۔ واہ ری ہمت، کیا کہنا، خاندانی رئیس ہیں نا!

بسم اللہ کی بے مروتی دیکھیے، نواب سے وہی چٹن جان کے گھر جانے کا بہانہ کر کے ان کو سویرے سے رخصت کر دیا۔ خدا جانے کس سے وعدہ تھا۔ اس واقعے کے دوسرے یا تیسرے دن کا ذکر ہے، میں خانم کے پاس بیٹھی ہوں۔ اتنے میں ایک بوڑھی سی عورت آئی، خانم صاحب کو جھک کے سلام کیا۔ خانم نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سامنے بیٹھ گئی۔

خانم: کہاں سے آئی ہو؟

بوڑھیا: کیا بتاؤں کہاں سے آئی ہوں۔ کوئی ہے تو نہیں؟

خانم: بوا یہاں کون ہے، میں ہوں اور تم ہو اور یہ چھو کر رہی ہے۔ اس کو بات سمجھنے کی تمیز نہیں، کہو۔

بڑھیا: مجھے نواب فخر النساء بیگم صاحب نے بھیجا ہے۔

خانم: کون فخر النساء بیگم صاحب؟

بڑھیا: اے لو تم نہیں جانتیں، نواب چھین صاحب.....

خانم: سمجھی، کہو۔

بڑھیا: بیگم صاحب نے مجھے بھیجا ہے۔ آپ بسم اللہ جان کی ماں ہیں نا؟

خانم: ہاں بات کہو۔

بڑھیا: بیگم صاحب نے کہا ہے کہ چھین صاحب میرا اکلوتا بیٹا ہے۔

میں بھی اس پر پروانہ ہوں اور اس کا باپ بھی پروانہ تھا۔ میرے نازوں کا پالا ہے اور اس کا چچا بھی دشمن نہیں ہے، اپنی اولاد سے بڑھ کر سمجھتا ہے۔ اس کے بھی ایک اکلوتی لڑکی ہے، بچپن کی سنگیتر۔ لڑکی پر گالی چڑھ چکی ہے۔ چھین نے شادی کرنے سے انکار کر دیا، اسی پر چچا کو برا معلوم ہوا۔ میں نے بھی دخل نہیں دیا۔ یہ سب تنبیہ کے لیے کیا گیا ہے۔ تمہاری لڑکی کا عمر بھر کا گھر ہے۔ جو تنخواہ لڑکا دیتا تھا، اس سے دس اوپر مجھ سے لینا مگر اتنا احسان مجھ پر کرو کہ شادی پر راضی کر دو۔ شادی کے بعد سب جائیداد اسی کی ہے۔ سوا اس کے اور ہے کون۔ میری اور چچا کی جان و مال کا مالک ہے۔ مگر اتنا خیال رکھو کہ یہ گھر تباہ نہ ہونے پائے۔ اس میں تمہارا بھی بھلا ہے اور ہمارا بھی۔ آئندہ تم کو اختیار ہے۔

خانم: بیگم صاحب کو میری طرف سے آداب تسلیمات کہنا اور عرض کرنا

کہ جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے، خدا چاہے تو وہی ہوگا۔ میں آپ کی عمر بھر کی لونڈی ہوں، مجھ سے کوئی امر خلاف نہ ہوگا۔

خاطر جمع رکھیے۔

بڑھیا: مگر بیگم صاحب نے کہا ہے کہ چھین کو اس کی خبر نہ ہو۔ بڑا ضدی

لڑکا ہے۔ اگر کہیں معلوم ہو گیا تو ہرگز نہ مانے گا۔

خانم: (ماما سے) کیا مجال! (مجھ سے) دیکھو چھو کری کہیں کسی سے یہ

قصہ نہ لے بیٹھنا۔

میں: جی نہیں۔

اس کے بعد بڑھیا نے علیحدہ لے جا کے خانم سے چپکے چپکے باتیں کیں وہ میں نے نہیں سیں۔ ماما کے رخصت کے وقت خانم کو اتنا کہتے سنا۔

خانم: میری طرف سے عرض کرنا کہ اس کی کیا ضرورت تھی۔ ہم لوگ تو

قد کی نمک خوار ہیں۔

بڑھیا کے جانے کے بعد خانم نے بسم اللہ کو بلا بھیجا اور کچھ ایسے دوا نچھرتکان میں پھونک دیئے کہ اب جو نواب صاحب آئے تو وہ آؤ بھگت ہوئی کہ ملازمت کے زمانے میں نہ ہوئی تھی۔

نواب صاحب بیٹھے ہیں بسم اللہ سے اختلاط کی باتیں ہو رہی ہیں میں بھی موجود ہوں۔ اتنے میں خانم صاحب خود بسم اللہ کے کمرے کے دروازے پر آ کے کھڑی ہوئیں۔

خانم: اے لوگو ہم بھی آویں؟

بسم اللہ: (نواب سے) ذرا سرک کے بیٹھو اماں آتی ہیں۔

(خانم سے) آئیے۔

خانم نے سامنے آتے ہیں نواب کو تین تسلیات کیں۔ میں نے آج کے دن کے سوا خانم کو اس طرح مودب ہو کر کسی کو سلام کرتے نہ دیکھا تھا۔

خانم: (نواب سے) حضور کا مزاج کیسا ہے؟

نواب: (گردن جھکا کے) الحمد للہ!

خانم: خدا خوش رکھے! ہم لوگ تو دعا گو ہیں۔ ہزار بڑھ جائیں مگر پھر

بھی وہی ٹکے کی مال زادی آپ کے ہاتھ کودیکھنے والی۔ آپ کو

خدا نے رکھیں کیا ہے۔ اس وقت ایک عرض لے کے حاضر ہوئی

ہوں۔ یوں تو بسم اللہ خدا سلامت رکھے! سال بھر سے آپ کی



خدمت میں ہیں، مگر میں نے کبھی آپ کو تکلیف نہیں دی، بلکہ حضور کے سلام کو بہت کم حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ اس وقت ایسی ہی ضرورت تھی جو چلی آئی۔

خانم تو یہ باتیں کر رہی تھی، بسم اللہ جان ان کا منہ دیکھ رہی ہیں کہ یہ کہتی کیا ہیں۔ میں کسی قدر بات کا پہلو سمجھے ہوئے تھی۔ نواب کی طرف دیکھ رہی ہوں۔ نواب کا یہ حال ہے کہ چہرے سے ایک رنگ جاتا ہے اور ایک آتا ہے۔ آنکھیں جھپنی جاتی ہیں، مگر چپکے بیٹھے ہیں۔  
خانم: تو پھر عرض کروں؟

نواب: (بہت ہی مشکل سے) کہئے

خانم: (مجھ سے) ذرا بوا حسینی کو بلا لینا۔

میں گئی اور بوا حسینی کو بلا لائی۔

خانم: (بوا حسینی سے) بوا ذرا دو شالے کی جوڑی تو اٹھالانا، وہی جو کل بکنے کو آیا ہے۔

”بکنے کو آیا ہے“ ان لفظوں نے نواب پر وہی اثر کیا جیسے کسی پر دفعتاً بجلی گر پڑے، مگر بہت ضبط کر کے چپکے سے بیٹھے رہے۔ اتنے میں بوا حسینی دو شالہ لے آئیں۔ کیسا پر متن زر کار دو شالہ کہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

خانم: (نواب کو دو شالہ دکھا کے) دیکھیے یہ دو شالہ کل بکنے کو آیا ہے۔

سوداگر دو ہزار کہتا ہے، پندرہ سو تک لوگوں نے لگا دیا ہے، وہ نہیں

دیتا۔ میری نگاہ میں سترہ بلکہ اٹھارہ تک مہنگا نہیں ہے۔ اگر

حضور پرورش کریں تو بھلا اس بڑھاپے میں آپ کی بدولت

ایک دو شالہ تو اوڑھ لوں۔

نواب خاموش بیٹھے رہے۔ بسم اللہ کچھ بولا ہی چاہتی تھیں کہ خانم نے جھڑک کے کہا۔

خانم: ٹھہر لڑکی، تو ہمارے بیچ میں نہ بولنا۔ تو تو آئے دن فرمائش کیا

کرتی ہے، ایک فرمائش ہماری بھی سہی۔

نواب پھر چپکے بیٹھے ہیں۔

خانم: اوکی نواب صاحب! سخی سے سوم بھلا جو جلدی دے جواب۔

کچھ تو ارشاد کیجیے، سکوت سے تو بندی کو تسکین نہ ہوگی۔ ہاں نہ سہی، نہیں سہی، کچھ تو کہہ دیجئے۔ میرے دل کا ارمان تو نکل جائے۔

نواب اب بھی چپ ہیں۔

خانم: لہذا حضور جواب دیجیے۔ یوں تو میری حقیقت ہی کیا ہے! موئی بازاری کسی! مگر آپ ہی لوگوں کی عزت دی ہوئی ہے۔ برائے خدا چھو کر یوں کے سامنے تو مجھ بڑھیا کو ذلیل نہ کیجیے۔

نواب: (آب دیدہ ہو کر) خانم صاحب! اس دو شالے کی کوئی اصل نہیں ہے، مگر تم کو شاید میرا حال معلوم نہیں۔ کیا بسم اللہ جان نے کچھ نہیں کہا؟ اور ہاں امر او جان بھی تو اس دن وہیں تھیں۔

خانم: مجھ سے کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ کیوں خیر تو ہے؟

بسم اللہ پھر کچھ بولنے کو تھیں کہ خانم نے اشاہ کیا، وہ چپ رہیں، ٹال کے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ میں پہلے ہی سے بت بنی بیٹھی تھی۔

نواب: اب ہم اس قابل نہیں رہے جو آپ کی فرمائشوں کو پورا کریں۔

خانم: آپ کے دشمن اس قابل نہ رہے ہوں! اور میں ایسی چھچھوری

نہیں جو روز فرمائش کیا کروں۔ فرمائش کریں یا نہ کریں، بسم اللہ

کریں! بھلا میں بوڑھی آڑھی میری فرمائش کیا اور میں کیا!

یہ کہہ کر خانم نے ایک آہ سرد بھری ”ہائے تقدیر! اب ہم اس لائق ہو گئے کہ ایسے ایسے رئیس

ایک ذرا سے چیتھڑے کے لیے ہم سے منہ چھپاتے ہیں۔“

میں دیکھ رہی تھی کہ خانم کا ایک ایک فقرہ نواب کے دل پر تشر کا کام دے رہا تھا۔

نواب: خانم صاحب! آپ سب لائق ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں اب میں

اس لائق نہیں رہا جو کسی کی فرمائش پوری کروں۔

اس کے بعد نواب نے اپنی تباہی کا مختصر حال کہا۔

خانم: خیر میاں! اس لائق تو آپ نہیں رہے کہ ایک ادنیٰ سی فرمائش

پوری کریں، پھر رنڈی کے مکان پر آنا کیا فرض تھا؟ حضور کو نہیں

معلوم کہ بیسواکین چار پیسے کی میت ہوتی ہیں۔ کیا آپ نے یہ  
مثل نہیں سنی کہ رنڈی کس کی جو رو..... ہم لوگ مروت کریں تو  
کھائیں کیا؟ یوں آئیے آپ کا گھر ہے میں منع نہیں کرتی، مگر  
آپ کو اپنی عزت کا خود ہی خیال چاہیے۔

یہ کہہ کے خانم فوراً کمرے سے چلی گئیں۔

نواب: واقعی مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ اب انشاء اللہ نہ آؤں گا۔

یہ کہہ کے وہ اٹھنے کو تھے کہ بسم اللہ نے دامن پکڑ کے بٹھالیا۔

بسم اللہ: اچھا تو اس کڑے کی جوڑی کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

نواب: (کسی قدر ترش ہو کر) میں نہیں جانتا۔

بسم اللہ: اے واہ! تم تو بالکل خفا ہو گئے جاتے کہاں ہو، ٹھہرو۔

نواب: نہیں بسم اللہ جان! اب مجھ کو جانے دو۔ اب میرا آنا بے کار

ہے۔ جب خدا ہمارے دن پھیرے گا تو دیکھا جائے گا۔ اور

اب کیا دن پھریں گے!

میں تو نہ جانے دوں گی۔

تو کیا اپنی اماں سے جوتیاں کھلوادو گی؟

(مجھ سے) ہاں سچ تو ہے بہن امر او! آج یہ بڑی بی کو ہوا کیا

تھا۔ برسوں ہو گئے میرے کمرے میں آج تک جھانگی تک

نہیں۔ آج آئیں بھی تو قیامت برپا کر گئیں۔ بھی اماں جان

چاہے خفا ہو جائیں چاہے خوش ہوں میں نواب سے رسم ترک

نہیں کر سکتی۔ آج نہیں ہے ان کے پاس نہ سہی ایسی بھی کیا

آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لینا۔ آخر یہی نواب ہیں جن کی بدولت

ہزاروں روپے اماں جان نے پائے۔ آج اگر زمانہ ان سے پھر

گنیا تو کیا ہم بھی طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں، گھر سے

نکال دیں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ اب اگر اماں زیادہ تنگ کریں گی تو

بہن امر او! میں سچ کہتی ہوں نواب کا ہاتھ پکڑ کر کسی طرف کو نکل

جاؤں گی۔ لو میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

میں بسم اللہ کی باتیں بہت اچھی طرح سمجھ رہی تھی ہاں میں ہاں ملاتی رہی۔

بسم اللہ: اچھا نواب! تم کہاں رہتے ہو؟

نواب: کہاں بتاؤں؟

بسم اللہ: آخر کہیں تو؟

نواب: تحسین گنج میں مخدوم بخش کے مکان پر رہتا ہوں۔ افسوس میں نہ

جانتا تھا کہ مخدوم ایسا نمک حلال آدمی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں

اس سے بہت شرمندہ ہوں۔

میں: یہ وہی مخدوم بخش ہے نا جو آپ کے والد کے وقت سے نوکر تھا؟

جس کو آپ نے موقوف کر دیا تھا؟

نواب: ہاں وہی مخدوم بخش۔ کیا کہوں اس وقت وہ کیسا کام آیا۔ خیر اگر

خدا نے چاہا.....

اتنا کہہ کے نواب کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر پڑے۔ اس کے بعد نواب صاحب بسم

اللہ کے ہاتھ سے دامن چھڑا کے کمرے کے باہر چلے گئے۔ میرا ارادہ تھا کہ نواب سے چلتے وقت

کچھ باتیں کروں گی اور اسی لیے ان کے ساتھ ہی اٹھی تھی مگر وہ اس قدر جلدزینے سے اتر گئے کہ

میں کچھ نہ کہہ سکی۔ نواب کے تئیں اس وقت بہت برے تھے۔ خانم کے باتوں نے نواب کے دل

پر سخت اثر کیا تھا۔ ان کی حالت بالکل مایوسی کی تھی۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ یہ سب باتیں جو خانم

نے آج کی ہیں وہ سب اس فہمائش کی تمہید ہیں جو اور کسی وقت پر موقوف رکھی گئی ہے مگر مجھے

بہت ہی تشویش تھی کہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کچھ کھا کے سو رہیں تو اور غضب ہو۔

سرشام میں اور بسم اللہ دونوں سوار ہو کے تحسین گنج گئے۔ مخدوم بخش کا مکان بڑی مشکل سے

ملا۔ کہاروں نے اس کے دروازے پر آواز دی۔ ایک چھوٹی سے لڑکی اندر سے نکلی۔ اس سے

معلوم ہوا کہ مخدوم بخش گھر پر نہیں ہے۔ نواب کو پوچھا اس نے کہا وہ صبح سے کہیں گئے ہوئے ہیں

ابھی تک نہیں آئے۔ دو گھنٹے تک انتظار کیا نہ نواب صاحب آئے نہ مخدوم بخش آخر مایوس ہو کر گھر

چلے آئے۔

دوسرے دن صبح کو مخدوم بخش نواب کو ڈھونڈتا ہوا آیا۔ معلوم ہوا کہ رات کو بھی اس کے



مکان پر نہیں گئے۔ شام کو ان کی والدہ کی ماما وہی بڑھیا جو ایک دن خانم کے پاس آئی تھی روتی چلتی آئی۔ اس سے بھی یہی خبر ملی کہ نواب کا کہیں پتا نہیں ہے۔ بیگم صاحب نے روتے روتے اپنا عجب حال کیا بڑے نواب سخت متفکر ہیں۔ اس واقعے کو کئی دن گزر گئے اور نواب چھبھن صاحب کا کہیں پتا نہ ملا۔

اس واقعے کے چوتھے پانچویں روز چھبھن صاحب کی انگوٹھی نخاس میں بکتی ہوئی پکڑی گئی بیچنے والے کو علی رضا بیگ کو تو ال کے پاس لے گئے۔ اس نے کہا مجھے امام بخش ساقی کے لڑکے نے بیچنے کو دی ہے۔ امام بخش ساقی کا لڑکا تو نہ ملا خود امام بخش پکڑ بلایا گیا۔ پہلے امام بخش صاف مکر گیا کہ میں اس انگوٹھی کو نہیں جانتا آخر مرزا نے خوب ڈانٹا اور دھمکایا تو قبول دیا۔

امام بخش: حضور! میں لب دریا لو ہے کے پل کے پاس حقہ پلاتا ہوں۔ جو لوگ دریا نہانے جاتے ہیں ان کے کپڑوں کی رکھوالی کرتا ہوں۔ پانچ دن کا ذکر ہے ایک شریف زادے کوئی بیس بائیس برس کی عمر ہوگی گورے گورے سے تھے بہت خوبصورت نوجوان تھے سر شام کے پل پر نہانے آئے۔ کپڑے اتار کے میرے پاس رکھوا دیئے مجھ سے لنگی لے کے باندھی خود دریا میں کود پڑے۔ تھوڑی دیر تک نہایا کیے۔ پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اور سب لوگ دریا سے نہا نہا کے نکلے کپڑے پہن پہن کے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے وہ صاحب نہ آئے۔ میں یہ سمجھا کہ کسی طرف تیرتے ہوئے نکل گئے ہوں گے۔ بڑی دیر ہو گئی۔ میں اس آسرے میں کہ اب آتے ہیں اب آتے ہیں پہر رات گئے تک بیٹھا رہا۔ آخر کو مجھے یقین ہو گیا کہ ڈوب گئے۔ اب میں نے دل میں یہ سوچا کہ اگر کسی کو خبر کرتا ہوں تو جھگڑوں میں پھنس جاؤں گا۔ کھنچا کھنچا پھروں گا۔ اس سے بہتر ہے کہ چپ ہو رہوں۔ ان کے کپڑے اٹھا کے گھر پر لے آیا۔ جیب میں سے یہ انگوٹھی نکلی اور ایک اور انگوٹھی ہے۔ اس میں خدا جانے کیا لکھا ہے۔ میں نے مارے ڈر کے آج تک کسی کو نہیں

دکھائی۔ میں تو اس انگوٹھی کو بھی نہ بیچتا، مگر میرا لڑکا شہدا ہو گیا ہے وہ چرا کے لے آیا۔

مرزا علی بیگ نے دو سپاہی کو توالی سے ساتھ کیے، وہ انگوٹھی اور کپڑے اس کے گھر سے منگوائے۔ انگوٹھی مہر کی تھی۔ مرزا علی رضا بیگ نے بڑے نواب کو اس سانچے کی خبر کی۔ کپڑے اور دونوں انگوٹھیاں گھر بھجوا دیں۔ امام بخش کو سزا ہو گئی۔

بسم اللہ: ہا! آخر نواب جھمبن صاحب تو ڈوب گئے نا؟ میں تو سچ کہوں اماں جان کی گردن پر ان کا خون ہوا۔

میں: افسوس! میں تو اسی دن دل میں کھٹک گئی تھی، اسی لیے اس دن ان کے ساتھ اٹھی تھی کہ کچھ سمجھا دوں گی، مگر وہ زینے سے اتر ہی گئے۔

بسم اللہ: ان کے سر پر قضا سوار تھی۔ خدا غارت کرے بڑے نواب کو! ان کو جائیداد سے بے حق کرتے نہ وہ اپنی جان دیتے۔

میں: خدا جانے اماں کا کیا حال ہوا ہوگا۔

بسم اللہ: سنا ہے بے چاری دیوانی ہو گئی ہیں۔

میں: جو نہ ہو کم ہے۔ یہی تو ایک اللہ آ میں کا لڑکا تھا۔ ایک تو بے چاری رائڈ بیوہ دوسرے یہ آفت ان کے سر پر ٹوٹ پڑی، سچ پوچھو تو ان کا گھر ہی تباہ ہو گیا۔

رسوا: تو نواب جھمبن صاحب کو آپ نے ڈبو ہی دیا۔ اچھا اس موقع پر ایک بات اور مجھے پوچھ لینے دیجیے۔

میں: پوچھئے۔

رسوا: نواب صاحب تیرنا جانتے تھے یا نہیں؟

میں: کیا معلوم یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں؟

رسوا: اس لیے کہ مجھے میری مچھلی صاحب نے ایک نکتہ بتایا تھا کہ جو شخص تیرنا جانتا ہے وہ اپنے قصد سے نہیں ڈوب سکتا۔

۷

کچھ ان کو امتحان وفا سے غرض نہ تھی

اک زار و ناتواں کے ستانے سے کام تھا

مرزا رسوا صاحب! آپ کو کسی سے کبھی عشق بھی ہوا ہے؟

امراؤ:

جی نہیں، خدا نہ کرے! آپ کو تو سینکڑوں سے عشق ہوا ہوگا، آپ

رسوا:

اپنا حال کہیے۔ ایسی ہی باتیں سننے کے تو ہم مشتاق ہیں، مگر آپ کہتی نہیں۔

امراؤ:

یوں تو میرا رنڈی کا پیشہ ہے اور یہ ہم لوگوں کا چلتا ہوا فقرہ ہے۔

جب کسی کو دام میں لایا جاتے ہیں اس پر مرنے لگتے ہیں۔ ہم

سے زیادہ کسی کو مرنا نہیں آتا۔ ٹھنڈی سانسیں بھرنی، بات

بات پر رو دینا، دو دو دن کھانا نہ کھانا، کنوئیں میں پیرا لٹکا کے بیٹھ

جانا، سکھیا کھا لینا، یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔ کیسا ہی سخت دل کا

آدمی کیوں نہ ہو، ہمارے فریب میں آ ہی جاتا ہے۔ مگر آپ

سے سچ کہتی ہوں کہ نہ مجھ سے کسی کو عشق ہوا نہ مجھ کو کسی سے۔

البتہ بسم اللہ جان کو عشق بازی کا بڑا ملکہ تھا۔ انسان تو انسان

فرشتہ ان کے جال سے نہیں نکل سکتا تھا۔ ہزاروں ان کے عاشق

تھے اور وہ ہزاروں پہ عاشق تھیں، سچے عاشقوں میں ایک مولوی

صاحب قبلہ کا چہرہ بھی تھا۔ ایسے ویسے مولوی نہ تھے، عربی کی

اوچھی اوچھی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ دور دور سے لوگ ان

سے پڑھنے آتے تھے۔ معقولات میں ان کا مثل و نظیر نہ تھا۔

جس زمانے کا میں ذکر کرتی ہوں، سن شریف ستر سے کچھ کم ہی

ہوگا۔ نورانی چہرہ سفید داڑھی، سر منڈا ہوا، اس پر عمامہ، عبائے

شریف، عصائے مبارک۔ ان کی صورت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا

تھا کہ آپ ایک چھٹی ہوئی شوخ نو جوان رنڈی پر عاشق ہیں اور اس طرح عاشق ہیں۔ ایک دن کا واقعہ عرض کرتی ہوں اس میں کسی طرح کا مبالغہ نہ سمجھئے بالکل صحیح صحیح ہے۔ آپ کے دوست..... میر صاحب قبلہ مرحوم جن کو دلبر جان سے تعلق تھا خود شاعر تھے اور عمدہ اشعار پر دم دیتے تھے۔ اسی سلسلے میں حسن پرستی کا بھی شوق تھا مگر نہایت ہی معقولیت کے ساتھ۔ شہر کی وضع دار رنڈیوں میں کون ایسی تھی جہاں وہ نہ جاتے ہوں۔

جی ہاں کہئے میں خوب جانتا ہوں۔ خدا ان کے درجات عالی کرے۔

رسوا:

وہ بھی اس موقع پر موجود تھے۔ شاید آپ کو یاد ہو بسم اللہ جان خانم سے لڑکے کچھ دنوں کے لیے اس مکان میں جا رہی تھیں جو بزازے کے پچھواڑے تھا۔

امراؤ:

میں اس مکان پر کبھی نہیں گیا۔

رسوا:

امراؤ:

خیر مگر بسم اللہ کے دیکھنے کے لیے اور اس غرض سے بھی کہ ماں بیٹیوں میں ملاپ کرادوں میں اکثر جایا کرتی تھی۔ ایک دن قریب شام محن میں تختوں کے چوکے پر گاؤں کے لگی بیٹھی ہیں۔ میر صاحب مرحوم ان کے قریب تشریف رکھتے ہیں۔ مولوی صاحب قبلہ سامنے دور مہذب بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کی بے بسی کی صورت مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ زیتون کی تسبیح پر چپکے چپکے (شاید) یا حفیظ یا حفیظ پڑھ رہے ہیں۔ میں جو گئی تو بسم اللہ نے ہاتھ پکڑ کر مجھے برابر بٹھالیا۔ میں میر صاحب اور مولوی صاحب کو تسلیم کر کے بیٹھ گئی۔ بسم اللہ نے چپکے سے میرے کان میں کہا ”تماشا دیکھو گی؟“

(حیران ہو کر) کیسا تماشا؟

دیکھو!

میں:

بسم اللہ:



یہ کہہ کر مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہوئیں۔ مکان کے محن میں ایک بہت پرانا نیم کا درخت تھا۔ مولوی صاحب کو حکم ہوا اس درخت پر چڑھ جاؤ مولوی صاحب کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور وہ تھر تھر کاہنے لگے۔ میں زمین میں گڑی جاتی تھی۔ میر صاحب منہ پھیر کے بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب بے چارے کبھی آسمان کو دیکھتے تھے کبھی بسم اللہ کی صورت کو۔ وہاں ایک حکم کر کے دوسرا حکم پہنچا اور فوراً تیسرا نادر حکم ”چڑھ جاؤ“ کہتی ہوں۔“

اب میں نے دیکھا کہ مولوی صاحب بسم اللہ کہہ کے اٹھے عباے شریف کو تختوں کے چوکے پر چھوڑا نیم کی جڑ کے پاس کھڑے ہوئے۔ پھر بسم اللہ کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک ذرا جیس بہ جیس ہو کے کہا ”ہوں“!

مولوی صاحب پائیچے چڑھا کے درخت پر چڑھنے لگے۔ تھوڑی دور جا کر بسم اللہ کی طرف دیکھا۔ اس دیکھنے کا شاید یہ مطلب تھا کہ بس یا اور۔

بسم اللہ: اور

مولوی صاحب اوپر چڑھتے پھر حکم کا انتظار کیا۔ ”اور“۔ اسی طرح درخت کی پھنگ کے پاس پہنچ گئے۔ اب اگر اور اوپر جاتے تو شاخیں اس قدر پتلی تھیں کہ ضرور ہی گر پڑتے اور جان بحق تسلیم ہو جاتے۔ بسم اللہ کی زبان سے ”اور“ نکلنے ہی کو تھا کہ میں قدموں میں گر پڑی میر صاحب نے نہایت منت کے ساتھ سفارش کی۔ بازے حکم ہوا ”اتر جاؤ“ مولوی صاحب چڑھنے کو چڑھ گئے تھے مگر اترنے میں بڑی دقت ہوئی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب گرے اور اب گرے مگر بخیر و عافیت اتر آئے۔ بے چارے پسینہ پسینہ ہو گئے دم پھول گیا۔ قریب تھا کہ گر پڑیں مگر اپنے کو سنبھال کے، نعلین پہن کے، تخت کے قریب آئے عباے مبارک زیب دوش کیا، چپکے بیٹھ گئے، تسبیح پڑھنے لگے۔ بیٹھ تو گئے مگر کسی پہلو قرار نہ تھا۔ چوٹے آزار شریف میں گھس گئے تھے اس سے بہت پریشان تھے۔

رسوا: بھئی واللہ! بسم اللہ بھی جب دل لگی باز رہتی تھی۔

امراؤ: دل لگی کا ذکر کیا وہ بے درد چپکی بیٹھی تھی، تبسم کا اثر بھی چہرے پر

نہ تھا۔ میں اور میر صاحب دونوں دم بخود بیٹھے تھے۔ ایک عجیب

عالم عبرت طازی تھا۔

رہے گا کیوں کوئی طرز ستم باقی زمانے میں

مزا آتا ہے اس کافر کو الفت آزمانے میں

رسوا: یہ جملہ عمر بھر ہنسنے کے لیے کافی ہے، تصور شرط ہے۔ تم نے تو بیان کیا اور میری آنکھوں کے سامنے بسم اللہ مولوی صاحب اور ان کی مقدس صورت میر صاحب، تم، صحن، نیم کا درخت، ان سب کی تصویر کھینچ گئی۔ یہ تو کچھ ایسا واقعہ ہے کہ دفعتاً ہنسی بھی نہیں آتی۔ مولوی صاحب کی حماقت پر رونا آتا ہے۔ بے شک بسم اللہ قیامت کی رنڈی تھی۔ ستر برس کا بڈھا اور اس پر یہ حکم ”درخت پر چڑھ جاؤ“ اور وہ بھی چڑھ گئے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بڑا دقیق مسئلہ ہے۔

امراؤ: واقعی آپ نہیں سمجھ سکتے۔ اس میں قیامت کی باریکی ہے۔ آخر بیان ہی کرنا پڑا۔

رسوا: اللہ بیان کیجئے۔ کیا ابھی کچھ اور توضیحت باقی ہے؟

امراؤ: ابھی بہت سی توضیحتیں باقی ہیں۔ لے سنیے۔

مولوی صاحب کے جانے کے بعد میں نے بسم اللہ سے پوچھا تھا۔

میں: بسم اللہ! یہ تجھ کو کیا ہوا تھا؟

بسم اللہ: کیا؟

میں: ستر برس کا بڈھا اور جو درخت پر سے گر پڑتا تو مفت خون ہوتا!

بسم اللہ: ہماری بلا سے خون ہوتا۔ میں تو اس موئے بوبک سے جلی ہوئی

تھی۔ کل میری دھن کو اس زور سے پٹا کہ ہڈی پھلی ٹوٹ گئی ہوتی۔

بات یہ تھی کہ بسم اللہ جان نے ایک بندریا پالی تھی۔ اس کا بڑا گہرا سہاگ تھا۔ ذرا اس کے ٹھاٹھ سن لیجئے۔ اٹلس کی گھنگریا، کامدانی کی کرتی، جالی کی اور ڈھنی، چاندی کی چوڑیاں، طوق گھونگھرو، سونے کی بالیاں، جلیبیاں امرتیاں کھانے کو۔ جب مول لی تھی تو مولیٰ ذرا سی تھی، دو تین برس میں کھا کھا کے خوب موٹی ہوئی تھی۔ جو لوگ جانتے تھے وہ تو خیر، جنبی آدمی پر دفعتاً جا پڑے تو کھلمی بندھ جائے۔ زور بھی اتنا تھا کہ اچھے مرد کا ہاتھ پکڑ لے تو چھڑائے نہ چھوڑے۔

جس دن مولوی صاحب نیم پر چڑھائے گئے ہیں اس سے ایک دن پہلے کا ذکر ہے کہ آپ تشریف لائے۔ تختوں کے چوکے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بسم اللہ جان کو مسخرہ پن سوچھا دھنو کو اشارہ کیا۔ وہ پشت سے چپکے چپکے آئی اور اچک کے مولوی صاحب کے کندھے پر جا بیٹھی۔ مولوی صاحب نے جوڑ کے دیکھا بے چارے گھبرا گئے زور سے جھٹک دیا۔ یہ تخت کے نیچے گر پڑی۔ یا میں تو جانتی ہوں خود چلی گئی ہوگی۔ مولوی صاحب پر کھوکھیا نے لگی۔ مولوی صاحب نے لاٹھی دکھائی وہ ڈر کے مارے بسم اللہ کی گود میں جا بیٹھی۔ بسم اللہ نے اسے تو چکار دوپٹے کا آٹھل اوڑھا دیا اور مولوی صاحب کو خوب دل کھول کے کوسا گالیاں دیں۔ اس پر بھی صبر نہ آیا دوسرے دن یہ سزا تجویز کی۔

رسوا: سزا مناسب تھی۔

امراؤ: مناسب میں تو کوئی شک نہیں مولوی صاحب کو کھٹکے کا لنگور بنا دیا۔

رسوا: واقعی مولوی صاحب لائق تعزیر تو تھے۔ قیس نے تو سگ لیلیٰ کو پیار کر کے گود میں اٹھالیا تھا اور مولوی صاحب نے بسم اللہ جان کی چیمٹی بندریا کو اول تو جھٹک دیا پھر یہ بے ادبی کہ اسے لاٹھی دکھائی عشق کی شان سے بہت بعید تھا۔

ایک دن رات کے آٹھ بجے بسم اللہ جان کے کمرے میں ہوں۔ بسم اللہ گارہی ہیں میں ظنورہ چھیڑ رہی ہوں خلیفہ جی طلبہ بجا رہے ہیں۔ اتنے میں مولوی صاحب تشریف لائے۔ بسم اللہ: (دیکھتے ہی) یہ آٹھ دن سے آپ کہاں تھے؟

مولوی صاحب: کیا کہوں مجھے تو اب کی ایسی تپ شدید لاحق ہوئی تھی کہ بچنا محال تھا مگر تمہارا دیدار دیکھنا تھا اس لیے جانبر ہو گیا۔

بسم اللہ: تو یہ کہیے وصال ہو گیا تھا۔

اس فقرے نے مجھ کو اور خلیفہ جی کو پھڑکا دیا۔

مولوی صاحب: جی ہاں آثار تو کچھ ایسے ہی تھے۔

بسم اللہ: واللہ اچھا ہوتا!

مولوی صاحب: میرے مرنے پر آپ کو کیا نفع ہوتا ہے؟

بسم اللہ: جی آپ کے عرس میں ہر سال جایا کرتے۔ گاتے، ناچتے،  
لوگوں کو رجاتے، آپ کا نام روشن کرتے۔  
اسی طرح چند باتوں کے بعد پھر گانا شروع ہوا۔ بسم اللہ نے حسب موقع یہ غزل شروع  
کی۔

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی  
اسی کافر کی ادا یاد آئی  
مولوی صاحب پر وجد کی حالت طاری تھی۔ آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ قطرے ریش  
مقدس سے ٹپک رہے تھے۔

اتنے میں سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک صاحب جوان، گندمی رنگ، گول چہرہ، سیاہ داڑھی،  
میانہ قد، کسرتی بدن، جامدانی کا انگرکھا پھنسا پھنسا پہنے ہوئے، کھلے پائینچوں کا پاجامہ، منہلی جوتا  
نہایت عمدہ جالی پر کی چکن کارو مال اوڑھے ہوئے داخل ہوئے۔ بسم اللہ نے دیکھتے ہی کہا، واہ  
صاحب! اس دن کے گئے آج آپ آئے ہیں۔ لے بس اب ٹہلیے۔ میں ایسی آشنائی نہیں  
رکھتی۔ اور وہ لال طاقی گرنٹ کے طاقے کہاں ہیں؟ اسی سے تو آپ نے منہ چھپایا۔  
وہ صاحب: (لجابت کے لہجے میں) نہیں سرکار! یہ بات نہیں، اس دن سے  
مجھے فرصت نہیں ملی۔ والدہ کی طبیعت علیل تھی، میں ان کی تیمار  
داری میں تھا۔

بسم اللہ: جی ہاں، آپ ایسے ہی سعادت مند ہیں، مجھے یقین ہے۔ یہ نہیں  
کہتے کہ آج کل ہن کی چھو کری پر آپ فریفتہ ہیں اور رات کو  
وہیں کی دربار داری ہوتی ہے۔ مجھے سب خبریں ملی ہیں، اور ہم  
سے فقرے ہوتے ہیں کہ والدہ کی طبیعت علیل تھی۔

اس آواز کو سن کے ایک مرتبہ مولوی صاحب نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ ان کی اور ان کی  
آنکھیں چار ہوئیں۔ مولوی صاحب نے فوراً منہ پھیر لیا۔ دوسرے صاحب کو جو دیکھتی ہوں تو  
چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں تھر تھر کاپنے لگے۔ جلدی سے دروازہ کھول کر بے نیچے  
تھے۔ بسم اللہ پکارتی کی پکارتی رہی، انہوں نے جواب نہ دیا۔



بسم اللہ بھی کچھ سمجھ کے پہلے تو چپ سی ہو گئی مگر پھر ایک مرتبہ تیوری چڑھا کے آپ ہی آپ کہنے لگی ”پھر باشد!“ اتنا کہہ کے گانے میں مصروف ہو گئی۔ اس دن کے بعد میں نے ان کو کبھی بسم اللہ کے پاس آتے نہیں دیکھا مولوی صاحب برابر آیا کیے۔

رسوا: جی ہاں! لگے زمانے کے لوگ ایسے ہی وضع دار ہوتے تھے۔

گانا ہو رہا تھا کہ گوہر مرزا شاید یہ سن کے کہ میں بھی یہاں ہوں یہیں چلے آئے۔ ان سے بسم اللہ سے ہنسی ہوتی تھی۔ گالی گلوچ سے لے کر کشتہ کشا تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ میرا مزاج ایسا چھپورانہ تھا کہ برامانتی۔

گوہر مرزا آتے ہی میرے اور بسم اللہ کے بیچ میں بیٹھ گیا اور جھپ سے بسم اللہ کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔

گوہر مرزا: آج تو خوب گارہی ہو۔ جی چاہتا ہے.....

اب جو دیکھتی ہوں تو مولوی صاحب کے ماتھے کی جھریوں میں حرکت ہونے لگی۔ ایک ہی مرتبہ گوہر مرزا کی نگاہ مولوی صاحب پر جا پڑی۔ پہلے تو بغور صورت دیکھی پھر اپنا کان زور سے پکڑا جھجک کے پیچھے ہٹا۔ (یہ معلوم ہوتا تھا گویا آپ ڈر گئے) بسم اللہ اس حرکت پر بے تحاشا ہنس پڑی خلیفہ جی مسکرانے لگے میں نے منہ پر رومال رکھ لیا مگر مولوی صاحب بہت ہی چپیں بہ چپیں ہوئے۔ بلکہ قریب تھا کہ اٹھ جائیں کہ بسم اللہ نے کہا ”بیٹھو“۔ بے چارے پھر بیٹھ گئے۔ بسم اللہ بھی کیا ہی شری تھی۔ مولوی صاحب پر یہ ظاہر کرنا منظور تھا کہ گوہر مرزا میرے آشنا ہیں تاکہ مولوی صاحب دیکھ کے جلیں۔ گوہر مرزا نے ہنسنا شروع کیا۔ بڑی دیر تک مولوی صاحب کو اس دھوکے میں رکھا اور ان کا وہ حال جیسے کوئی انگاروں پر لوٹ رہا ہو بھلے جاتے ہیں۔ مارے ہنسی کے میرے پیٹ میں بل پڑے جاتے ہیں۔ آخر مولوی صاحب کی بے بسی پر مجھ کو رحم آیا میں نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس پر بسم اللہ مجھ سے ناراض بھی ہو گئیں۔ میں نے گوہر مرزا کی طرف متوجہ ہو کے کہا ”لے اب من چلا پن کر چکے چلو۔“

اب مولوی صاحب کو معلوم ہو گیا کہ گوہر مرزا کا مجھ سے رسم ہے بسم اللہ کا کوئی واسطہ نہیں۔ بہت ہی خوش ہوئے باچھیں کھل گئیں۔

رسوا: مولوی صاحب کو تو پاک محبت تھی نا؟

امراؤ: پاک محبت تھی۔

رسوا: پھر ان کو جلنا نہ چاہئے تھا۔

امراؤ: واہ! کیا پاک محبت میں رشک نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے۔

رسوا: تو پاک محبت نہ ہوگی۔

امراؤ: اب یہ ان کا ایمان جانے میں تو یہی سمجھتی تھی۔

خانم کی نوچیوں میں یوں تو میرے سوا ہر ایک اچھی تھی، مگر خورشید کا جواب نہ تھا۔ پری کی صورت تھی، رنگ میدا شہاب، ناک نقشہ گویا صانع قدرت نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ آنکھوں میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ موتی کوٹ کے بھر دیئے ہیں۔ ہاتھ پاؤں سڈول، نور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ بھرے بھرے بازو، گول کلاسیاں، جامہ زیبی وہ قیامت کی کہ جو پہنا معلوم ہوا کہ یہ اسی کے لیے مناسب تھا۔ اداؤں میں وہ دل فریبی، وہ بھولا پن کہ جو ایک نظر دیکھے ہزار جان سے فریفتہ ہو جائے۔ جس محفل میں جا کے بیٹھ گئی، معلوم ہوا کہ ایک شمع روشن ہو گئی۔ بیسیوں رنڈیاں بیٹھی ہوں، نظر اسی پر پڑتی ہے۔ یہ سب کچھ تھا، مگر تقدیر کی اچھی نہ تھی۔ اور تقدیر کو بھی کیوں الزام دیجئے، خود اپنے ہاتھ عمر بھر خراب رہی، حقیقت یہ ہے کہ وہ رنڈی پنے کے لائق نہ تھی۔ بیسواڑے کے ایک زمیندار کی لڑکی تھی۔ صورت سے شرافت ظاہر تھی۔ حسن خداداد تھا، مگر اس حسن و جمال پر خط یہ تھا کہ کوئی مجھ پر عاشق ہو۔ یوں تو وہ خود ہی پیار کرنے کے لائق تھی۔ کون ایسا ہوگا جو اس پر فریفتہ نہ ہو جاتا ہو۔ اول ہی اول پیارے صاحب کو محبت تھی۔ ہزار ہارو پے کا سلوک کیا۔ واقعی جان دیتے تھے۔ خورشید نے بھی انہیں اچھی طرح کسا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ سچا عاشق ہے، خود جان دینے لگیں۔ دن دن بھر کھانا نہیں کھاتیں۔ اگر ان کو کسی دن اتفاق سے دیر ہو گئی، بیٹھی زار و قطار رو رہی ہیں۔ ہم سب نے صلاح دی ”دیکھو خورشید! ایسا نہ کرو۔ مردے بے مردت ہوتے ہیں۔ تمہارے ان کے صرف آشنائی ہے، آشنائی کی بنیاد کیا۔ نکاح نہیں ہوا، بیاہ نہیں ہوا۔ اگر ایسا چاہو گی تو اپنا برا چاہو گی، پچھتاؤ گی۔ آخر ہمارا ہی کہا ہوا۔ پیارے صاحب نے جب دیکھا کہ رنڈی پیار کرتی ہے، لگے غمزے کرنے۔ یا تو آٹھوں پہر بیٹھے رہتے تھے یا اب ہیں کہ دو دو پہروں نہیں آتے۔ خورشید جان دیئے دیتی ہے۔ روتی ہے، میٹھتی ہے، کھانا نہیں کھاتی، عجیب حال ہے، خانم کو صورت سے نفرت ہو گئی، یہاں تک کہ آنا جانا، کھانا پینا، آدمیوں کی تنخواہ سب موقوف۔

میں نہیں سمجھ سکتی کہ اس حسن کے ساتھ عشق اس کے دل میں کس نے بھر دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی مرد آدمی کی جو رو ہوتی تو میاں بیوی میں خوب نباہ ہوتا۔ عمر بھر مرد پاؤں دھو دھو کے پیتا،

خورشید بہت ہی بھگی عورت تھی۔ سینکڑوں روپے پھسلا پھسلا کے لوگ کھا گئے۔ فقیر فقراء سے آپ کو بڑا اعتقاد تھا۔ ایک دن ایک شاہ صاحب تشریف لائے۔ وہ ایک کے دو کرتے تھے۔ خورشید نے اپنے کڑے اور کنگن کی جوڑیاں اتار دیں۔ شاہ صاحب نے ایک کوری ہانڈی منگوائی، اس میں سیاہ تل بھروا دیئے، کڑے کنگن ہانڈی میں رکھ کر چھنی ڈھانک دی۔ شال بان کا ایک پارچہ گلے میں باندھناڑے سے باندھ دیا۔ شاہ صاحب روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے کہہ گئے آج نہ کھولنا، کل صبح کو کھولنا، مرشد کے حکم سے ایک کے دو ہو جائیں گے۔ صبح کو ہانڈی کھولی گئی، کالے تلوں کے سوا کچھ نہ ملا۔

ایک جوگی نے کالے ناگ کا پھن منہ سے نکال کے دکھایا کہ یہ تجھے پرسوں آ کے ڈس جائے گا۔ خورشید نے کانوں سے پتے بالیاں اتار کے حوالے کیں۔ خورشید کو کبھی غصہ آتا ہی نہ تھا۔ ایسی نیک دل اور نیک مزاج عورتیں تو بہو بیٹیوں میں بھی کم ہوتی ہیں، رنڈیوں کا تو ذکر کیا۔ مگر ہاں ایک دن غصہ آیا، جس دن پیارے صاحب مانجھے کا جوڑا پہن کے آئے۔ اول تو چپکی بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد...



مانجھے کے جوڑے کو پرزے پرزے کر ڈالا۔ اب رقت شروع ہوئی۔ دو دن تک رویا کی۔ تمام دنیا نے سمجھایا، کچھ نہ مانا۔ آخر بخار آنے لگا۔ دو مہینے بیمار رہی۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ حکیموں نے دق تجویز کیا، لیکن خدا کے فضل سے دو مہینے کے بعد مزاج خود بہ خود رو بہ اصلاح ہو گیا۔ اب پیارے صاحب سے بظاہر جھٹم چھٹا ہو گئی۔ اس کے بعد اور لوگوں سے ملاقات ہوئی، مگر کسی سے دل نہ لگا، اور نہ کسی کا دل ان سے اس لیے کہ بے تو جہی اور بے اعتنائی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ بظاہر ملتی تھیں مگر دل نہ ملتا تھا۔

ساون کا مہینہ ہے، سہ پہر کا وقت ہے، پانی برس کے کھل گیا ہے۔ چوک کے کوٹھوں اور بلند دیواروں پر جا بجا دھوپ ہے۔ ابر کے ٹکڑے آسمان پر ادھر ادھر آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ پچھتم کی طرف رنگ رنگ کی شفق پھولی ہوئی ہے۔ چوک میں سفید پوشوں کا مجمع زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ آج زیادہ تر مجمع کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جمعے کا دن ہے، لوگ عیش باغ کے میلے کو جلد جلد قدم اٹھائے چلے جاتے ہیں۔ خورشید، امیر جان، بسم اللہ اور میں میلے جانے کے لیے بن ٹھن رہی ہیں۔ دھانی دوپٹے جو ابھی رنگریز رنگ کے دے گیا ہے، چنے جاتے ہیں، بالوں میں کنگھیاں ہو رہی ہیں، چوٹیاں گوندھی جاتی ہیں، بھاری زیور نکالے جاتے ہیں۔ خانم صاحب سامنے چوکے پر گاؤں تکیے سے لگی بیٹھی ہیں۔ بوا حسنی بھی پیچوان لگا کے پیچھے ہٹی ہیں۔ خانم صاحب کے سامنے میر صاحب بیٹھے ہیں۔ میلے جانے پر اصرار کر رہے ہیں۔ وہ کہتی ہیں ”آج میری طبیعت سست ہے، میں نہیں جانے کی۔“ ہم لوگ دعائیں مانگ رہے ہیں خدا کرے نہ جائیں تو میلے کی بہار ہے۔

خورشید پر اس دن سب غم کا جو بن ہے۔ گوری رنگت ملل کے دھانی دوپٹے سے پھوٹی نکلتی ہے۔ اودی گرٹ کا پا جامہ بڑے بڑے پائینچوں کا سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ پھنسی پھنسی کرتی قیامت ڈھا رہی ہے۔ ہاتھ گلے میں ہلکا ہلکا زیور ہے۔ ناک میں ہیرے کی کیل، کانوں میں سونے کی انتیاں، ہاتھوں میں کڑے گلے میں موتیوں کا کنٹھا۔ سامنے کمرے میں قد آدم آئینہ لگا ہے، اپنی صورت دیکھ رہی ہیں۔ کیا کہوں کیا صورت تھی! اگر میری صورت ویسی ہوتی تو اپنے عکس کی آپ ہی بلائیں لے لیتی۔ مگر ان کو یہ غم ہے کہ ہائے اس صورت کو کوئی دیکھنے والا نہیں۔ پیارے صاحب سے بگاڑ ہی ہو چکا ہے۔ چہرہ اداس اداس ہے۔ ہائے وہ اداسی بھی سب غم کر رہی ہے۔ اچھی صورت والوں کا سب کچھ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت اس پری پیکر کی صورت دیکھنے سے



دل پسا جاتا ہے۔ اور تو کوئی مثال اپنے دل کی حالت کی سمجھ میں نہیں آتی، یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی ایسے شاعر کا کوئی شعر درد آ میز سنا ہے اور دل اس کے مزے لے رہا ہے۔

بسم اللہ کی صورت ایسی بری نہ تھی۔ کھلتا ہوا ساناؤ لا رنگ، کتابی چہرہ، سوتواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں، سیاہ پتلی، چھریا بدن، بوٹا سا قد، کار چوبی تو لوں جوڑا، کاہی کریب کا دو پٹا بست ٹکی ہوئی، زرد گرٹ کا پا جامہ، بیش قیمت زیور سر سے پاؤں تک، گہنے میں لدی ہوئی، اس پر طرہ پھولوں کا گہنا۔ این مین چوتھی کی دہن معلوم ہوتی تھی۔ پھر اس بات بات میں شوخی و شرارت۔ میلے میں پہنچ کر کسی کا منہ چڑھا دیا، کسی سے آنکھ لڑائی۔ جب وہ دیکھنے لگا تو منہ پھیر لیا۔ ہاں یہ کہنا بھول گئی کہ ہم لوگ بناؤ سنگھار کر کے میانوں میں سوار ہوئے، میلے پہنچے۔

میلے میں وہ بھیڑیں تھیں کہ اگر تھائی پھینکو تو سر ہی سر جائے۔ جا بجا کھلونے والوں، مٹھائی والوں کی دکانیں، خوانچے والے، میوہ فروش، ہار والے، تنبولی، ساقیتیں، غرض کہ جو کچھ میلوں میں ہوتا ہے، سب کچھ تھا۔ مجھے اور تو کسی چیز سے کچھ کام نہیں، لوگوں کے چہرے دیکھنے کا ہمیشہ شوق ہے، خصوصاً میلے تماشوں میں۔ خوش، ناخوش، مفلس، تو مگر بے وقوف، عقل مند، عالم، جاہل، شریف، رذیل، سخی، بخیل، یہ سب حال چہرے سے کھل جاتا ہے۔ ایک صاحب ہیں کہ وہ اپنے تن زیب کے انگر کھے اور اودی صدری، نکرہ دار ٹوپی، چست گھٹنے اور مخملی چڑھویں جوتے پر اتراتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ کوئی صاحب ہیں صندلی رنگا ہوا دوپٹا سر سے آڑا باندھے ہوئے، ریڈیوں کو گھورتے پھرتے ہیں۔ ایک صاحب آئے تو ہیں میلہ دیکھنے، مگر بہت ہی مکدر چہرے، جبیں، کچھ چپکے چپکے بڑبڑاتے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بیوی سے لڑکے آئے ہیں۔ جن باتوں کے جواب بروقت نہ سوجھے تھے انہیں اب یاد کر رہے ہیں۔ کوئی صاحب اپنے چھوٹے سے لڑکے کی انگلی پکڑے اس سے باتیں کرتے چلے آتے ہیں۔ ہر بات میں اماں کا نام آتا ہے۔ ”اماں کھانا پکاتی ہوں گی، اماں کا جی ماندہ ہے، اماں سو رہی ہوں گی، اماں جاگتی ہوں گی۔ بہت شوخی نہ کیا کرو، نہیں تو اماں حکیم کے ہاں چلی جاویں گی۔“ ایک صاحب سات آٹھ برس کی لڑکی کو سرخ کپڑے پہنا کے لائے ہیں، کندھے پر چڑھائے ہوئے ہیں۔ ناک میں ننھی سی ننھی سی ہے۔ اونچی چوٹی گندھی ہوئی، لال شال باف کا موباف پڑا ہے۔ ہاتھوں میں چاندی کی چوڑیاں ہیں۔ معصوم کے دونوں ہاتھ زور سے

پکڑے ہوئے ہیں۔ کلاسیاں دکھی جاتی ہیں۔ کوئی چوڑیاں نہ اتار لے۔ کہیے پھر پہنا کے لانا ہی کیا ضرور تھا۔

لیجئے دوسرے صاحب۔ ایک اور ان کے یار غار بھی ساتھ ہیں۔ فرمائشی گالیاں چل رہی ہیں ”اماں پان تو کھاؤ“ کھٹ سے پیسہ تنبولی کی دکان پر پھینکا۔ معلوم ہوا کہ آپ بڑے تو نگر ہیں۔ پیسے دو پیسے کی آپ کے آگے کیا اصل ہے۔ فوراً ہی حقے والے کو آواز بھی دے دی۔

”بھئی ساقی ادھر آنا حقہ سلگا ہوا ہے؟“ ایک اور یار ان کے آ موجود ہوئے۔ معمولی گالی گلوچ کے بعد ملاقات ’سلام‘ بندگی ’مزاج‘ پر سی بے تکلف دوستوں میں ہوا کرتی ہے۔ ”ابے پان تو کھلوا“ لطف یہ کہ آپ مسلمان یار ہندو۔ جب تنبولی نے پان دیئے جھٹ سے بڑھ کے لے آئے۔ ”ارے یار بھول گئے“ اب یہ کھیانے ہوئے۔ ٹینٹ سے ایک پیسہ نکالا۔ ”لو بھئی ہمیں بھی دو پان دینا“ الہ بچی بھی چھوڑ دینا، چوننا زیادہ نہ ہو۔“ دوست سے ”اچھا تو چلم تو پلوادو گے؟“ چلم حقے سے اتارتے ہی تھے کہ ساقی نے گھر کے دیکھا۔ فوراً ہاتھ سے حقہ اور جیب سے پیسہ نکال کے دینا پڑا۔

گوہر مرزا نے موتی جھیل کے کنارے فرش بچھوا دیا تھا وہیں جا کے ٹھہرے۔ ادھر ادھر درختوں میں پھرتے رہے۔ سرشام سے دو گھڑی رات گئے تک میلے کی سیر کی، پھر گھر چلنے کی ٹھہری۔ اپنے اپنے میانوں میں آ کر سوار ہوئے۔ اب جو دیکھتے ہیں تو خورشید جان کا میانہ خالی ہے ان کا کوئی پتہ نہیں۔ پہلے تو شبہ ہوا کہ یہیں کہیں درختوں میں ہوں گی۔ دور دور تک تلاش کے لیے آدمی دوڑائے۔ گوہر مرزا نے جا کے سارا میلہ چھان مارا، کہیں پتا نہ ملا۔ آخر مایوس ہو کے گھر واپس آئے۔ خانم نے سنتے ہی سر پیٹ لیا۔ حمام گھر کو صدمہ ہوا۔ میں خود رات بھر رویا کی۔ پیارے صاحب کے مکان پر آدمی گیا۔ بے چارے اسی وقت دوڑے ہوئے آئے۔ ہزاروں قسمیں کھائیں کہ مجھے بالکل نہیں معلوم۔ میں میلے بھی نہیں گیا۔ بیگم کی طبیعت علیل ہے جاتا تو کیونکر جاتا۔ پیارے صاحب پر یوں ہی بے جاسا گمان تھا، ان کی قسمیں کھانے کے بعد کسی کو شبہ بھی نہ رہا، وجہ یہ تھی کہ وہ شادی کے بعد بیوی کے ایسے پابند ہو گئے تھے کہ چوک کا آنا جانا انہوں نے بالکل موقوف کر دیا تھا۔ رات کو گھر سے نکلتے ہی نہ تھے۔ خورشید کے گم ہونے کی خبر سن کے کچھ اگلی محبت کے خیال سے کچھ خانم کی مروت سے نہیں معلوم کس طرح چلے آئے تھے۔

۱۱۵ — امر او جان ادا

حصہ دوم

قیدی الفت صادر ہا ہوتے ہیں

خورشید کے گم ہونے کے ڈیڑھ مہینے کے بعد ایک صاحب جن کی وضع شہر کے بانگوں جیسی تھی۔ سانولا رنگ، چھریا بدن، ایک دو شالہ کمر سے لپیٹے اور ایک سر سے باندھے میرے کمرے میں درانا چلے آئے اور آنے کے ساتھ ہی سامنے قالین کے کنارے بیٹھ گئے۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ طبیعت میں کسی قدر کمینہ پن ہے، یا ابھی اخیلے ہیں، رنڈیوں کے یہاں جانے کا کم اتفاق ہوا ہے۔ اس وقت میں اکیلی بیٹھی تھی۔ میں نے بوا حسینی کو آواز دی، وہ کمرے میں آئیں۔ ان کے آتے ہیں وہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور کسی قدر بے تکلفی کے ساتھ بوا حسینی کا ہاتھ پکڑ لیا، علیحدہ لے جا کر کچھ باتیں کیں، جن میں کچھ میں نے سنیں اور کچھ نہیں۔ اس کے بعد بوا حسینی خانم کے پاس گئیں۔ وہاں سے آنے پر پھر باتیں ہوئیں۔ آخر کلام یہ تھا۔ ”آپ کو ایک مہینے کی تنخواہ پیشگی دینی ہوگی۔“ ان صاحب نے کمرے سے بینڈ روپوں کی نکالی، بوا حسینی نے گود پھیلائی، انہوں نے چھن سے روپے پھینک دیئے۔

بوا حسینی: یہ کتنے ہیں؟

وہ صاحب: نہیں معلوم، گن لیجیے۔

بوا حسینی: اے ہے مجھے تو نگوڑا گنا بھی نہیں آتا۔

وہ صاحب: میں جانتا ہوں، پچھتر روپے ہوں گے۔ شاید ایک دو کم ہوں یا زیادہ۔

بوا حسینی: میاں پچھتر کے کہتے ہیں؟

وہ صاحب: تین بیسی اور پندرہ، پچیس کم سو۔

بوا حسینی: پچیس کم سو۔ تو یہ کتنے دن کی تنخواہ ہوئی؟



وہ صاحب: پندرہ دن کی۔ کل وہ بھی پندرہ دن کی دے دوں گا۔ پورے ڈیڑھ سو نخر چے آپ کو پہنچ جائیں گے۔

یہ ”نخر چے“ سن کر مجھے بہت ہی برا معلوم ہوا۔ اب تو بالکل ہی یقین ہو گیا کہ کوئی ایسا ہی ویسے ہیں، مگر مجبور زندگی کا پیشہ دوسرے پرائے بس میں کرتی تو کیا کرتی۔

بوا حسینی روپے لے کے خانم کے پاس گئیں۔ خانم اس وقت نہیں معلوم کس نیکی کے دم میں تھیں کہ فوراً منظور کر لیا۔ بلکہ مجھے تعجب ہوا اس لیے کہ بڑے سے بڑے رئیس سے روپے کے بارے میں ایک دم کے لیے مروت نہیں کرتی تھیں یا اس وقت ایک دن کا وعدہ مان لیا۔

اس معاملے کے طے ہونے کے بعد وہ صاحب میرے ہی کمرے میں شب باش ہوئے۔ کوئی پہر رات باقی ہوگی، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے کمرے کے نیچے آ کے دستک دی۔ وہ صاحب فوراً اٹھ بیٹھے اور کہا ”لو اب میں جاتا ہوں“ کل شب کو پھر آؤں گا۔“ چلتے وقت پانچ اشرفیاں اور تین انگوٹھیاں ایک سونے کی یا قوت کا نگینہ ایک فیروزے کی ایک ہیرے کی مجھ کو دیں اور کہا یہ تم اپنے پاس رکھنا، خانم کو نہ دینا۔ میں نے خوشی خوشی ہاتھ میں پہنیں اور اپنی انگلیوں کو دیکھنے لگی۔ مجھے بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتی تھیں۔ پھر صندوقچہ کھولا، اشرفیاں اور انگوٹھیاں چور خانے میں چھپا کے رکھ دیں۔

دوسرے دن شب کو وہی صاحب پھر آئے۔ اس وقت میں تعلیم لے رہی تھی۔ وہ ایک کنارے آ کر بیٹھ گئے۔ گانا ہوا کیا۔ پانچ روپے سازندوں کو دے دیئے۔ استاد جی اور سار جتئے خوشامد کی باتیں کرنے لگے۔ استاد جی نے کمر میں جو دو شالہ بندھا ہوا تھا اس کے اٹیٹھنے کی فکر کی۔ پھر منہ پھوڑ کے مانگا، مگر وار خالی گیا، انہوں نے نہ دیا۔

وہ صاحب: استاد جی! روپیہ پیسہ اور جس چیز کو کہیے موجود ہے، یہ دو شالہ میں نہیں دے سکتا، ایک دوست کی نشانی ہے۔

استاد جی اپنا منہ لے کے چپ ہو رہے۔

اس کے بعد تعلیم موقوف ہوئی۔ بوا حسینی کو باقی کچھ تر گن دیئے گئے۔ پانچ روپے بوا حسینی کو اپنی طرف سے دیئے۔ وہ رخصت ہوئیں۔ جب وہ اور میں صرف دو آدمی کمرے میں رہ گئے میں نے پوچھا ”آپ نے مجھ کو کہاں دیکھا تھا جو عنایت کی؟“

دو مہینے ہوئے عیش باغ کے میلے میں۔

میں: اور پھر آئے دو مہینے کے بعد؟

وہ: میں باہر چلا گیا تھا اور اب پھر جانے والا ہوں۔

اب میں نے رنڈی پنہ کی لگاؤٹ شروع کی۔

میں: تو ہمیں چھوڑ کے چلے جاؤ گے؟

وہ: نہیں، پھر بہت جلد چلا آؤں گا۔

میں: اور تمہارا مکان کہاں ہے؟

وہ: مکان تو فرخ آباد میں ہے، مگر یہاں بہت کام رہتا ہے، بلکہ رہتا نہیں ہوں، کچھ دنوں کے لیے باہر چلا جاتا ہوں، پھر چلا آتا ہوں۔

میں: اور یہ دو شالہ کس کی نشانی ہے؟

وہ: کسی کی نہیں۔

میں: واہ! میں سمجھ گئی، یہ تمہاری آشنا کی نشانی ہے۔

وہ: نہیں، تمہارے سر کی قسم! میری کوئی آشنا و آشنا نہیں ہے، بس تنہی ہو جو کچھ ہو۔

میں: تو پھر مجھے دے دو۔

وہ: میں نہیں دے سکتا۔

یہ بات مجھے بہت ناگوار ہوئی۔ اتنے میں انہوں نے بڑے بڑے موتیوں کی مالا جس میں زمرہ کی ہٹریں لگیں ہوئی تھیں اور ایک جوڑی ہیرے کے کڑے کی اور دو انگوٹھیاں سونے کی میرے آگے رکھ دیں۔ یہ سب تو میں نے خوشی خوشی اٹھالیا۔ صندوقچہ کھول کے بند کرنے لگی، مگر مجھے تعجب ہوا کہ یہ ہزاروں کی رقم تو یوں مجھ کو دے دیتے ہیں، مگر یہ دو شالہ زیادہ سے زیادہ پانسو کا ہوگا، اس سے کیوں انکار کیا۔ واقعی مجھ کو دو شالہ پسند نہ تھا جو میں زیادہ اصرار کرتی۔ اپنے کام سے کام تھا۔

ان صاحب کا نام فیض علی تھا۔ پہر ڈیڑھ پہر رات گئے آتے تھے اور کبھی آدھی رات کو، کبھی پچھلے پہر سے اٹھ کے چلے جاتے تھے۔ مہینے ڈیڑھ مہینے میں کئی مرتبہ دستک یا سیٹی کی آواز میں نے سنی اور فوراً ہی فیض علی اٹھ کر روانہ ہو گئے۔ فیض علی سے رسم ہوئے کوئی ڈیڑھ مہینہ گزرا ہوگا کہ میرا

صندوقچہ سادے اور جڑاؤ گہنے سے بھر گیا۔ اشرفیوں اور روپوں کا شمار نہیں۔ اب میرے پاس خانم اور بوا حسینی سے چھپا ہوا دس بارہ ہزار کا مال ہو گیا تھا۔

فیض علی سے اگر مجھ کو محبت نہ تھی تو نفرت بھی نہ تھی۔ اور نفرت ہونے کی کیا وجہ! اول تو وہ کچھ بد صورت بھی نہ تھے۔ دوسرے لینا دینا عجب چیز ہے۔ میں سچ کہتی ہوں جب تک وہ نہ آتے میری آنکھیں دروازے کی طرف لگی رہتی تھیں۔ گوہر مرزا کی آمد و رفت ان دنوں صرف دن کی رہ گئی تھی۔ شب کے آنے والوں میں سے بھی اکثر لوگ سمجھ گئے تھے کہ میں کسی کی پابند ہو گئی ہوں۔ اس لیے سویرے سے کھسک جاتے تھے اور جو صاحب جم کے بیٹھے تھے ان کو میں کسی حیلے سے ٹال دیتی تھی۔

خورشید کی تلاش بہت کچھ ہوئی مگر کہیں سراغ نہ ملا۔ اس اثناء میں فیض علی کئی مرتبہ دو دو تین تین دن تک غائب رہے اور پھر چلے آئے۔ واقعی فیض علی کو مجھ سے بہت محبت تھی جس کا اظہار طرح طرح سے ہوتا۔ اگر میرا دل ابتدا سے گوہر مرزا کی طرف مائل نہ ہو گیا ہوتا تو میں ضرور فیض علی سے محبت کرتی اور اسی کو دل دیتی۔ اس پر بھی میں نے ان کی دل جوئی اور ظاہر داری میں کسی طرح کمی نہیں کی۔ میں نے فیض علی کو فریب دے رکھا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے اور وہ بے چارہ میرے دام میں پھنسا ہوا تھا۔ جو کچھ خفیہ اس نے مجھ کو دیا اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی۔ خانم اور بوا حسینی کے کہنے سے مجھے فرمائشیں بھی کرنا پڑتی تھیں۔ ان کی بجا آوری کو بھی وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کو روپے پیسے کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ ایسا دل چلا آدمی نہ میں نے رئیسوں میں دیکھا نہ شہزادوں میں۔

رسوا: جی ہاں کیوں نہیں مال مفت دل بے رحم بھلا اس کے برابر کس کا دل ہو سکتا ہے؟

امراؤ: مال مفت کیوں!

رسوا: نہیں تو اپنی اماں جان کا زیور روز آپ کو اتارا تار کے لا دیا کرتا تھا؟

امراؤ: ہمیں کیا معلوم تھا۔

شب کے آنے والوں میں ایک پنابل جوہری تھے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کے چلے جاتے تھے۔ ان کو چار آدمیوں میں بیٹھنے کا مزا تھا۔ اگر ان کی خاطر داری ہوتی رہے تو اور کسی کے آنے جانے

سے انہیں کچھ غرض نہ تھی۔ مہینے میں دوسروں کے پے کا نقد سلوک اور فرمائشوں کا ذکر نہیں۔ فیض علی کی ملاقات کے زمانے میں ان کی آمد و رفت بھی کم ہو گئی تھی۔ یا تو ہر روز آیا کرتے یا دوسرے تیسرے دن آنے لگے۔ پھر ایک مرتبہ پندرہ دن کا غوطہ لگایا اب جو آئے تو کچھ اداس اداس۔ معمولی باتوں کا جواب دیتے ہیں اور پھر خاموش ہو جاتے ہیں۔ میں نے سبب پوچھا۔

پنابل: کیا تم نے سنا نہ ہوگا؟

میں: کیا؟

پنابل: ہم تو تباہ ہو گئے، گھر میں چوری ہو گئی، پشیمنیوں کا سب اثاثہ اٹھ گیا۔

میں: (چونک کے) ہائیں! چوری ہو گئی؟ کتنے کا مال گیا؟

پنابل: سب اٹھ گیا، رہا کیا، دولاکھ کا جواہر اٹھ گیا۔

میں دل میں ہنسی۔ ہنسی اس بات پر کہ ان کے باپ چھنامل تو کروڑ پتی مشہور تھے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ دولاکھ بہت بڑی رقم ہے، مگر ان کے نزدیک کیا اصل ہے۔ بہ ظاہر منہ ہنا کے بہت افسوس کیا۔

پنابل: جی ہاں، آج کل شہر میں چوریاں بہت ہوتی ہیں۔ نواب ملکہ

عالم کے ہاں چوری ہوئی، لالہ گوہر پرشاد کے ہاں چوری ہوئی۔

اندھیر ہے۔ سنا ہے باہر سے چور آئے ہوئے ہیں۔ مرزا علی

رضا بیگ بے چارے حیران ہیں۔ شہر کے چور سب طلب ہو

گئے تھے، کسی سے کچھ پتا نہیں ملا۔ لوگ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں

کہ یہ ہمارا کام نہیں۔

پنابل کے آنے کے دوسرے دن میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوں کہ چوک میں ایک شور

ہوا۔ میں بھی چلمن کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اب جو دیکھتی ہوں تو خلایق کا انبوہ ہے۔

ایک: آخر گرفتار ہوئے نا؟

دوسرا: واہ مرزا، کیا کہنا! کو تو ال ہو تو ایسا ہو۔

تیسرا: کیوں بھی کچھ مال کا پتا بھی لگا؟

چوتھا: بہت کچھ برآمد ہوا، مگر ابھی بہت سا باقی ہے۔



پانچواں: میاں فیضو بھی گرفتار ہوئے؟

چھٹا: وہ کیا آتے ہیں۔

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ میاں فیضو بندھے چلے آتے ہیں۔ سپاہیوں کا گارد ساتھ ہے، گردِ خلّاق کا انبوه ہے۔ میاں فیضو منہ پر دو پٹا ڈالے ہوئے ہیں، ان کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ یہ دو پہر سے پہلے کا واقعہ ہے۔

حسب معمولی فیض علی کوئی پہر رات گئے تشریف لائے۔ کمرے میں میں ہوں اور وہ ہیں۔ آتے ہی کہا ”آج ہم باہر جاتے ہیں پرسوں آئیں گے۔ دیکھو! امراؤ جان جو کچھ ہم نے دیا ہے اس کو کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ نہ بوا حسینی کو دینا نہ خانم کو دکھانا۔ تمہارے کام آئے گا۔ ہم پرسوں ضرور آئیں گے۔ اچھا یہ کہو کہ ہمارے ساتھ تھوڑے دنوں کے لیے باہر چل سکتی ہو؟“

میں: تم جانتے ہو کہ میں اپنے بس میں نہیں۔ خانم صاحب کو اختیار ہے تم ان سے کہو۔ اگر وہ راضی ہوں تو مجھے کیا عذر ہے۔

فیض علی: سچ ہے۔ تم لوگ بڑے بے وفا ہوتے ہو۔ ہم تو تم پر جان دیتے ہیں اور تم ایسا خشک جواب دیتی ہو۔ اچھا بوا حسینی کو بلواؤ۔

میں نے بوا حسینی کو آواز دی وہ آئیں۔

فیض علی: (میری طرف اشارہ کر کے) بھلا کچھ دنوں کے باہر بھی جاسکتی ہیں؟

حسینی: کہاں؟

فیض علی: فرخ آباد۔ میں ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں۔ میری وہاں ریاست ہے۔ بالفعل میں دو مہینے کے لیے وہاں جاتا ہوں۔ اگر خانم صاحب منظور کریں۔ اگر خانم صاحب منظور کریں تو دو مہینے کی تنخواہ پیشگی، بلکہ اس کے علاوہ جو کچھ کہیں میں دینے کو تیار ہوں۔

بوا حسینی: مجھے تو نہیں یقین کہ خانم منظور کریں گی۔

فیض علی: اچھا تم پوچھو تو۔

بوا حسینی خانم کے پاس گئیں۔

میرے نزدیک بوا حسینی کو خانم کے پاس بھیجنا بے کار تھا اس لیے کہ مجھے یقین تھا کہ وہ ہرگز

منظور نہ کریں گی۔

فیض علی نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا تھا کہ اگر میں اپنے اختیار میں ہوتی تو مجھے ان کے ساتھ جانے میں کچھ بھی عذر نہ ہوتا۔ میں یہ خیال کرتی تھی کہ جب اس شخص نے گھر بیٹھے اتنا سلوک کیا تو وطن جا کر نہال کر دے گا۔ میں اسی خیال میں تھی کہ اتنے میں بوا حسینی نے آکر صاف جواب دے دیا۔ ”ان کا باہر جانا کسی طرح نہیں ہو سکتا“

فیض علی: گنی تنخواہ پر سہی!

بوا حسینی: چو گنی تنخواہ پر بھی نہیں ممکن۔ ہم لوگ باہر نہیں جانے دیتے۔

فیض علی: خیر جانے دو.....

(بوا حسینی چلی گئیں۔ میں نے دیکھا کہ فیض علی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں۔ یہ حال دیکھ کے مجھے بہت ہی ترس آیا۔)

معشوقوں کی بے وفائیوں کا تذکرہ قصے کہانیوں میں جب سنتی تھی تو مجھے افسوس ہوتا تھا برا کہتی تھی۔ مجھے یہ خیال آیا کہ اگر اس کا ساتھ نہ دیا تو میری بے وفائی اور احسان فراموشی میں کوئی شبہ نہیں۔ میں نے دل میں ٹھان لیا کہ میں اس شخص کا ضرور ساتھ دوں گی۔

میں: اچھا تو میں چلوں گی۔

فیض علی: چلو گی؟

میں: کوئی جانے دے یا نہ جانے دے میں ضرور چلوں گی۔

فیض علی: کیوں کر؟

میں: چھپ کر۔

فیض علی: اچھا تو پرسوں رات کو ہم آئیں گے۔ پہر بھر رات رہے تمہیں

یہاں سے نکال لے چلیں گے۔ دیکھو دغانہ دینا، ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

میں: میں اپنی خوشی سے چلنے کو کہتی ہوں۔ تم سے وعدہ کر چکی ہوں۔

میرے وعدے کو بھی دیکھنا۔

فیض علی: بہت اچھا دیکھا جائے گا۔

اس رات فیض علی کوئی ڈیڑھ پہر رات رہے میرے پاس سے اٹھ کر چلے گئے۔ ان کے

جانے کے بعد میں دل میں غور کرنے لگی۔ وعدہ تو کر لیا مگر دیکھیے ہوتا کیا ہے۔ جاؤں یا نہ جاؤں۔ جب فیض علی کی محبت اور اپنے وعدے کا خیال آتا تھا تو دل کہتا تھا جانا چاہیے، مگر پھر جیسے کوئی منع کرتا تھا کہ نہ جاؤ، خدا جانے کیا ہو، کیا نہ ہو۔

اسی ادھیڑ بن میں صبح ہو گئی۔ کوئی بات طے نہ ہوئی۔ دن بھر یہی باتیں دل میں رہیں۔ رات کو اتفاق سے میرے پاس کوئی نہ آیا، کمرے میں اکیلی اسی فکر میں رہی، آخر نیند آ گئی۔ صبح کو ذرا دن چڑے تک سویا کی۔ گوہر مرزا نے کچی نیند میں جھنجھوڑ کے اٹھا دیا۔ مجھے بہت ہی برا معلوم ہوا۔ دن بھر نشے کا سا خسار رہا۔ نہیں معلوم کس بات پر بوا حسینی سے الجھن ہو گئی۔ ہاں خوب یاد آیا، بات یہ تھی کہ کہیں باہر سے مجھ آ یا تھا۔ بوا حسینی نے مجھ سے کہا ”جاؤ گی؟“ اس وقت میرے سر میں درد ہو رہا تھا، میں نے صاف انکار کر دیا۔ بوا حسینی نے کہا ”واہ جب نہ تب انکار کر دیتی ہو، آخر اس پیشے میں ہو کر کیا کرو گی؟“ میں نے کہا ”میں تو نہ جاؤں گی۔“ بوا حسینی نے کہا ”نہیں، جانا ہو گا۔ خاص تمہاری فرمائش ہے، اور خانم صاحب نے وعدہ کر لیا ہے اور روپیہ بھی لے لیا ہے۔“ میں نے کہا ”بوا! میں نہیں جانے کی روپیہ پھیر دو۔“

بوا حسینی: بھلا تم جانتی ہو، خانم صاحب روپیہ لے کے کبھی پھیرتی ہیں؟  
میں: چاہے کسی کی طبیعت اچھی ہو چاہے نہ اچھی ہو! اگر خانم صاحب روپیہ نہ پھیریں گی تو میں اپنے پاس سے پھیر دوں گی۔  
بوا حسینی: آہ ہا! اب تم بڑے روپے والی ہو گئی ہو۔ لاؤ پھیر دو۔  
میں: کتنا روپیہ ہے؟  
بوا حسینی: سو روپے۔

میں: سو روپے لو گی یا کسی کی جان؟  
بوا حسینی: کو بھی اس دن خدا جانے کہاں کی ضد چڑھ گئی تھی۔

بوا حسینی: بڑی کھری ہو تو دے دو۔  
میں: شام کو دے دوں گی۔  
بوا حسینی: وہاں باہر کے آدمی بیٹھے ہوئے ہیں، وہ شام تک کے لیے کیوں مانیں گے؟

بوا حسینی اپنے دل میں یہ سمجھی تھیں کہ اس کے پاس روپیہ کہاں سے آیا۔ اگر اس وقت اس

حیلے سے تنگ کی جائے گی تو خواہ مخواہ بحرے پر راضی ہو جائے گی۔ میرے صندوقے میں اس وقت کچھ نہ ہوں گے تو ہزار ڈیڑھ ہزار کی اشرفیاں تھیں، زیور کا ذکر نہیں۔ مگر اس وقت بوا حسینی کے سامنے صندوقے کھولنا مناسب نہ تھا۔

میں: جاؤ گھنٹے بھر میں لے جانا۔

بوا حسینی: گھنٹے بھر میں کیا موکل دے جائیں گے؟

میں: ہاں دے جائیں گے۔ جاؤ ابھی اس وقت دق نہ کرو۔ میری طبیعت اچھی نہیں۔

بوا حسینی: آخر کچھ کہہ تو لڑکی کیا ہوا؟

میں: مجھے بخار کی سی حرارت ہے اور سر میں شدت سے درد ہو رہا ہے۔

بوا حسینی: (ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دیکھا) ہاں سچ تو ہے پنڈا پھیکا ہے مگر

بحرے کو تو کہیں پرسوں جانا ہوگا، جب تک خدا نہ کرے کیا طبیعت کا یہی حال رہے گا۔ روپے کیوں پھیرے جائیں۔

میں اس بات کا کچھ جواب نہ دے پائی تھی کہ بوا حسینی جلدی سے اٹھ کے چل دیں۔ بوا حسینی کی اس ہماہمی سے مجھے بہت ہی غصہ معلوم ہوا۔ اسی وقت دل میں بدی آگئی۔ دل نے کہا، واہ جی! جب ان لوگوں کو ہمارے دکھ بیماری کا خیال نہیں، اپنے مطلب سے مطلب ہے، تو ان لوگوں کے ساتھ رہنا بیکار ہے۔

رسوا: کبھی پہلے بھی یہ خیال آپ کے دل میں آیا تھا۔

امراؤ: کبھی نہیں۔ مگر آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں؟

رسوا: اس لیے کہ فیض علی نے جو وہ سہارا دیا تھا، اسی سے آپ کے دل

میں یہ خیال پیدا ہوا۔

امراؤ: یہ تو کھلی ہوئی بات ہے۔

رسوا: کھلی ہوئی بات تو ہے، مگر اس میں ایک بار کی بھی ہے۔

امراؤ: وہ بار کی کیا ہے، خدا کے لیے جلدی کہیے؟

رسوا: فیض علی کے ساتھ نکل چلنا، وعدہ کرنے سے پہلے آپ کے دل

میں ٹھن گیا تھا، اب دل بہانے ڈھونڈ رہا تھا کہ کیوں کر نکل



چلوں۔

امراؤ: نہیں یہ بات نہ تھی۔ میں دو دلی ہو رہی تھی۔ کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ گوہر مرزا کے بے وقت چھیڑنے اور بوا حسینی کی زبردستی سے میں نے جانے کا قصد کر لیا تھا۔ بلکہ اس وقت تک کچھ یوں ہی سا ارادہ تھا۔ جب رات کو فیض علی آئے تو ان کی صورت اور مستعدی دیکھ کے پکا ارادہ ہو گیا۔

رسوا: جی نہیں پہلے ہی سے قصد مصمم ہو چکا تھا اسی لیے گوہر مرزا کا چھیڑنا اور بوا حسینی کی ضد آپ کو بری معلوم ہوئی ورنہ یہ معمولی باتیں تھیں۔ ایسا تو اکثر ہوا کرتا ہوگا۔

امراؤ: میں نے مانا کہ ایسا ہی ہوگا اچھا پھر وہ منع کرنے والا کون تھا؟ میں سچ کہتی ہوں کہ چلتے چلتے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کان میں کہہ رہا ہے ”امراؤ نہ جا“ کہا مان ”جس وقت دو تین زینے اتر چکی ہوں اس وقت تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی ہاتھ پکڑ کے کھینچے لیتا ہے کہ نہ جا“ مگر میں نے نہ مانا۔

رسوا: یہ روکنے والا بڑا زبردست تھا۔ اسی کا حکم نہ ماننے کی تو آپ نے سزا بھگتی۔

امراؤ: اچھا میں سمجھی! یہ وہ چیز ہے جو نیک کاموں کی ہدایت کرتی ہے اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

رسوا: جی نہیں یہ وہ نہیں تھی۔ خانم کے مکان پر رہنا کون سا اچھا کام تھا۔ آپ کی باتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ بدکاری کو ہمیشہ برا سمجھتی رہی ہیں اگرچہ آپ کی حالت نے آپ کو اس کے کرنے پر مجبور کیا ہو۔ پھر خانم کے مکان پر رہنے سے ایک شخص کا ساتھ دے کے اس کا پابند ہو جانا بدرجہا بہتر تھا۔ بات یہ تھی کہ فیض علی کے حسن سلوک نے آپ کو اس کے ساتھ نکل چلنے کی ترغیب دی تھی۔ قیافہ شناسی کے شوق اور اس میں کسی قدر

ملکہ ہو جانے سے آپ اچھی خاصی مردم شناس ہو گئی تھیں۔ عشق باغ کے میلے میں لوگوں کے چہرے دیکھنے کا حال میں نے بڑے شوق سے سنا تھا۔ فیض علی کے کرتوت آپ پر ظاہر نہ تھے مگر اس کی شکل و شمائل رفتار و گفتار سے آپ کے دل کو آگاہی ہو گئی تھی کہ اس کے ساتھ جانے میں کچھ نہ کچھ خطرہ ضرور ہے۔ مگر اس کی فریب کی باتوں اور روپے کے لالچ نے آپ کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے تھے۔ افسوس! اگر آپ علم مردم شناسی کے اصول سے واقف ہوتیں تو کبھی اس کے دام میں نہ آتیں۔

امراؤ: میں پڑھوں گی، کسی کتاب کا نام لیجیے۔

خانم کا مکان چوک میں بہت ہی محفوظ جگہ ہے۔ پچھم کی طرف بازار ہے، اتر دکن اونچی اونچی رینڈیوں کے کمرے ہیں۔ ایک بیبا جان کا مکان ہے دوسری طرف حسین باندی رہتی ہے۔ پچھواڑے میں حسین علی صاحب کا دیوان خانہ ہے۔ غرض یہ کہ کسی جانب سے چور کا لگاؤ نہیں ہے۔ اس پر بھی تین پاسی نوکر تھے جو رات بھر کوٹھوں پر پھرتے رہتے تھے۔ جب سے فیض علی کی آمد و رفت شروع ہوئی، مکا پاسی خاص میرے کمرے کے دروازے پر رہتا تھا، کیونکہ فیض علی رات گئے آیا کرتے تھے اور پھر پہر رات چلے جاتے تھے دروازے بند کرنے اور قفل لگانے کے لیے مکا مقرر کیا گیا ہے۔

شب کو حسب وعدہ فیض علی آئے۔ فیض علی نے اسے کمرے میں بلایا، ایک روپیہ جیب سے نکال کے دیا، کہا ”جاؤ کوئی کی دکان سے اس کی امرتیاں لے آؤ“ اور اے لو یہ روپیہ انعام لو۔ تم کو ہم نے کچھ نہیں دیا تھا۔ دروازہ بھیڑ دینا، ہم جاگ رہے ہیں۔ کوئی ڈر نہیں۔“

مکا سلام کر کے کمرے کے باہر نکلا۔ فیض علی نے کہا، ”لو اب چلو۔ میں ابھی دو جوڑے کپڑے دن ہی سے گٹھری میں باندھ رکھے تھے زیور کا صندوقچہ میں نے پہلے ہی کھسکا دیا تھا۔ گٹھری بغل میں دبائی۔ اکبری دروازے کی طرف کا راستہ لیا۔ مخاس میں تیل گاڑی پہلے ہی کھڑی کی گئی تھی۔ ہم دونوں سوار ہوئے اور چل نکلے۔ ہنڈولنے کے ناکے سے تھوڑی دور جا کے فیض علی کا سائیکس گھوڑا لیے ہوئے ملاؤہ بھی بھل کے ساتھ ہولیا۔ صبح ہوتے ہوتے موہن لال گنج

پہنچے۔ یہاں سرائی میں دو پہر تک قیام ہوا بھٹیاری سے کھانا پکوا کے کھایا۔

وال ارہر کی بے نمک پھیکی

مطلقاً جس میں بو نہ تھی گھی کی

تیسرے دن رائے بریلی میں داخل ہوئے۔ یہاں سفر کے مناسب کپڑا خریدا۔ میرے دو جوڑے بنوائے۔ لکھنؤ سے جو کپڑے پہن کے آئی تھی اتار کے گٹھری میں باندھے۔ رائے بریلی سے نیل گاڑی کو جو لکھنؤ سے آئی تھی رخصت کیا۔ دوسری گاڑی کرایہ کی لال گنج کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ قصبہ رائے بریلی سے کوئی نو دس کوس کے فاصلے پر ہے۔ شاموں شام پہنچ گئے۔ رات سرائے میں رہے۔ فیض علی ضروری سودے سلف کے لیے بازار گئے۔ جس کوٹھری میں ہم تھے اس کے پاس والی کوٹھری میں ایک دیہاتی رنڈی اتری ہوئی تھی۔ نصیبین نام تھا، گہنے پاتے سے درست تھی، کپڑے بھی اچھے تھے۔ تھی تو دیہاتی مگر زبان بہت صاف تھی۔ لب و لہجہ قصباتیوں کا سا تھا۔ میری اس کی دیر تک باتیں ہوا کیں۔

نصیبین: آپ کہاں سے آئی ہیں؟

میں: فیض آباد سے۔

نصیبین: فیض آباد میں تو میری بہن پیارن رہتی ہے، آپ ضرور جانتی ہوں گی۔

میں: (آخر پہچان گئی ناکہ میں بھی رنڈی ہوں) میں کیا جانوں۔

نصیبین: فیض آباد میں کون ایسی پتیا ہے جو ہم کو نہیں جانتی۔

میں: بہت دنوں سے ان کے گھر بیٹھ گئی ہوں۔ یہ لکھنؤ میں رہتے ہیں،

اسی لیے میں بھی اکثر وہیں رہتی ہوں۔

نصیبین: آخر پیدائش تو تمہاری فیض آباد کی ہے نا؟

میں: (یہ تو بالکل سچ کہتی ہے، اب کیا جواب دوں) ہاں پیدا تو وہاں

ہوئی، مگر بچنے سے باہر رہی۔

نصیبین: تو فیض آباد میں کسی کو نہیں جانتی؟

میں: کسی کو نہیں۔

نصیبین: یہاں کیوں آنا ہوا؟

میں: ان کے ساتھ ہوں۔

نصیبین: لکھنؤ ہوتی ہوئی آئی ہو؟

میں: ہاں

نصیبین: پھر سیدھا راستہ چھوڑ کے ادھر بیڑ میں کہاں آئی ہو زہرت گنج ہو

کے اناؤ چلی گئی ہوتیں؟

میں: رائے بریلی میں ان کو کچھ کام تھا۔

نصیبین: میں نے اس لیے کہا کہ ادھر کا راستہ بہت خراب ہے۔ ڈاکوؤں

کے مارے مسافروں کی آمد و رفت بند ہے۔ پلیہ کی بیڑ میں

سینکڑوں کو لوٹ لیا۔ آناؤ کا راستہ ادھر ہی سے ہو کے ہے۔ تم

تین آدمی ہو جس میں دو مرد ایک عورت ذات تمہارے گلے

میں گہنا بھی ہے۔ بھلا تمہاری کیا حقیقت ہے وہاں تو برائیاں

لٹ جاتی ہیں۔

میں: تن بہ تقدیر۔

نصیبین: بڑی دل کی کڑی ہو۔

میں: پھر کیا کروں!

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں جن کا دہرانا کوئی ضروری نہیں اور نہ مجھے یاد ہیں۔

ہاں میں نے پوچھا۔

میں: تم کہاں جاؤ گی؟

نصیبین: ہم تو گدائی کو نکلے ہیں۔

میں: میں نہیں سمجھی؟

نصیبین: اے لو گدائی نہیں جانتیں، کیسی پتیا ہو؟

میں: بہن میں کیا جانوں، گدائی تو بھیک مانگنے کو کہتے ہیں؟

نصیبین: ہمارے دشمن بھیک مانگیں اور سچ پوچھو تو کہوں، پتیا کی ذات

بھیک منگنی ہے اس میں ڈیرے دار ہو یا نہ ہو۔



یہ تو سچ ہے، مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ گدائی کسے کہتے ہیں۔  
سال میں ایک مرتبہ ہم لوگ گھر سے نکل کے گاؤں گاؤں  
پھرتے ہیں۔ امیروں رئیسوں کے مکان پر جا کے اترتے ہیں۔  
جو کچھ جس کے مقدور میں ہوتا ہے، ہمیں دیتا ہے۔ کہیں بچرا ہوتا  
ہے، کہیں نہیں ہوتا۔

میں:  
نصیبین:

اچھا اس کو گدائی کہتے ہیں؟  
ہاں، اب سمجھیں۔

میں:  
نصیبین:

یہاں کسی رئیس کے پاس آئی ہوئی ہو؟

میں:  
نصیبین:

یہاں سے تھوڑی دور پر شیو دھیان سنگھ ایک راجا کی گڑھی ہے  
انہی کے پاس گئی تھی۔ راجا صاحب کو بادشاہی حکم پہنچا ہے  
ڈاکوؤں کے بندوبست کو گئے ہوئے ہیں۔ کئی دن ٹھہری رہی  
آخر دم گھبرا یا۔ یہاں سے دو کوس پر ایک گاؤں ہے سمریہا، وہ  
گاؤں بالکل پتریوں کا ہے۔ وہاں میری خالہ رہتی ہیں۔ کل ان  
کے پاس جاؤں گی۔

پھر کہاں جاؤں گی؟

میں:  
نصیبین:

وہیں ٹھہری رہوں گی۔ جب راجا صاحب آئیں گے تو پھر گڑھی  
کو جاؤں گی اور بہت سے ڈیرے بھی ان کے انتظار میں  
ٹھہرے ہوئے ہیں۔

کیا راجا صاحب کو ناچ بجرے سے بہت شوق ہے؟  
بہت شوق تھا۔

میں:  
نصیبین:

کیوں اب کیا ہوا؟

میں:

جب سے ایک پتیا لکھنو سے لائے ہیں ہم لوگوں کی کوئی قدر  
نہیں رہی۔

نصیبین:

اس پتیا کا کیا نام ہے؟

میں:

نام تو مجھ کو یاد نہیں، صورت دیکھی ہے۔ گوری گوری سی ہے۔ ذرا

نصیبین:

چہرے مہرے کی اچھی ہے۔

گاتی تو خوب ہوگی؟

میں:

خاک! گانا دانا کچھ نہیں آتا ہاں ناچتی ذرا اچھا ہے۔ راجا

نصیبین:

صاحب اسی پر لٹو ہیں۔

کتنے دنوں سے وہ پتہ آیا آئی ہے؟

میں:

کوئی چھ مہینے ہوئے ہوں گے۔

نصیبین:

رات کو میں نے فیض علی سے راستے کی خرابی کا حال بیان کیا۔ انہوں نے کہا ”خاطر جمع رکھو

ہم نے بند دست کر لیا ہے۔“

دوسرے دن منہ اندھیرے ہم لال گنج کی سرائے سے روانہ ہوئے۔ نصیبین کی گاڑی

ہمارے پیچھے پیچھے تھی۔ فیض علی گھوڑے پر سوار تھے۔ ہم اور نصیبین باتیں کرتے جاتے تھے۔ تھوڑی

دور چل کے سمریہ ملا۔ نصیبین نے دور سے ہم کو وہ گاؤں دکھایا۔ سڑک کے کنارے کھیت تھے۔

ان میں کچھ گنوار نیاں پانی دے رہی تھیں، کچھ کھیت زرا رہی تھیں۔ ایک پرانی چل رہی تھی۔ اس

میں ایک مسنڈی عورت دھوتی باندھے نیل ہنکار رہی تھی۔ ایک پرلے رہی تھی۔ نصیبین نے کہا یہ

سب پتیاں ہیں۔ میں نے دل میں کہا واہ یہ پیشہ بھی کیا، پھر اس قدر محنت جو مردوں سے بمشکل

ہو۔ آخر ان کو پتہ کیا ضرور تھا۔ مگر ان کی صورتیں بھی ایسے ہی کاموں کے لائق ہیں۔ لکھنؤ

میں کنڈے والیاں، دہی والیاں، گھونسلیں آتی ہیں، ان کی شکل بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ نصیبین یہاں

سے رخصت ہوئی۔

کوئی دو کوس اور جا کے ایک نشیب ملا۔ جا بجا بیڑ بڑے بڑے غار سامنے ندی کا کنارہ نظر

آیا۔ دونوں طرف دور تک گنجان درختوں کی قطار تھی۔ جب ہم اس موقع پر پہنچے ہیں دھوپ اچھی

طرح نکل چکی تھی، کوئی پہر دن چڑھا ہوگا۔ اس سڑک پر سوا ہمارے اور کوئی راستہ چلتے دکھائی نہ دیتا

تھا، چاروں طرف سناٹا تھا۔ ندی کے پاس پہنچ کے فیض علی نے گھوڑا آگے بڑھایا۔ میں روکتی کی

روکتی رہ گئی، وہ یہ جاوہ جا بہت دور نکل گئے۔ تھوڑی دور تک گھوڑا نظروں سے غائب رہا، پھر ندی

کے پار جا کے پیچھے دوڑا چلا گیا تھا۔ اب میں ہوں اور گاڑی بان ہے۔ اتنے میں میں نے دور سے

دیکھا کہ دس پندرہ گنوار گاڑی کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں۔ میں نے دل میں کہا خدا خیر

کرے! تھوڑی دیر میں گنواروں نے آ کر گاڑی کو گھیر لیا۔ سب تلواریں باندھے ہوئے تھے

بندوقیں کندھے پر تھیں توڑے سگ رہے تھے۔

گنوار: (گاڑی بان سے) گاڑی روک۔ کون ہے گاڑی میں؟

گاڑی بان: یہ سواری بریلی سے آئی ہے، آناؤ کا بھاڑا کیا ہے۔

گنوار: روک گاڑی۔

گاڑی بان: گاڑی کیوں روکیں، خان صاحب کے ہاں کی زنائی سواری

ہے۔

گنوار: کوئی مرد ساتھ نہیں ہے؟

گاڑی بان: مرد آگے بڑھ گئے ہیں، آتے ہوں گے۔

گنوار: اترو بی بی گاڑی سے؟

ایک: پردہ کھول کے کھینچ لو یار۔ سسری پتیا تو ہے اس کا پردہ کیسا۔

ایک گنوار آگے بڑھا، گاڑی کا پردہ الٹ کے مجھے گاڑی سے اتارا۔ تین آدمی مجھے گھیر کے

کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں ندی کی طرف سے گرداٹھی اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ جب

گھوڑے قریب آئے میں نے دیکھا آگے فیض علی کا گھوڑا ہے، پیچھے اور دس پندرہ سوار ہیں۔

گنواروں نے دیکھتے ہی بندوقوں کی ایک باڑھ ماری۔ اس میں دو سوار ادھر سے گر پڑے۔ پھر

تکواریں میان سے نکلیں۔ سوار سر پر ہی آگئے تھے۔ ادھر سے بھی تلواریں کھینچ گئیں۔ دو ایک ہاتھ

چلے ہوں گے۔ تین گنوار ادھر سے زخمی ہو کے گرے اور ادھر سے ایک سوار گرا۔ گنوار بھاگ نکلے۔

”اچھا کہاں جاؤ گے۔ دیکھو ندی کے اس پار کیا ہوتا ہے۔“

گنواروں کے جانے کے بعد میں پھر گاڑی میں بیٹھی۔ جس سوار کے زخم آیا تھا اس کے

پٹیاں کسی گئیں۔ وہ بھی گاڑی میں میرے ساتھ بٹھایا گیا۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ اب دو سوار ہماری

گاڑی کے ادھر ادھر ہیں۔ کچھ سوار آئے ہیں، کچھ پیچھے ہیں۔

فیض علی: (اپنے ساتھ سے) بھائی فضل علی کسی طرح لکھنؤ سے نکلنا ہی نہ

ہوتا تھا۔ بڑی مشکل سے جان چھڑا کے آیا ہوں۔

فضل علی: یہ نہیں کہتے عیش میں پڑے تھے۔

فیض علی: ہاں یہ تو کہو گے۔

فضل علی: کہیں گے کیا، تحفہ بھی تو ساتھ ساتھ ہے۔ ذرا بھابھی صاحب کو

ہم بھی تو دیکھیں۔

فیض علی: آپ سے کوئی پردہ ہے دیکھئے۔

فضل علی: ڈیرے پر چل کے ہمارا دیکھیں گے۔

اتنے میں گاڑی ندی کے کنارے پہنچ گئی۔ کنارہ بہت اونچا تھا، مجھ کو گاڑی سے اتر کر پیدل چلنا پڑا۔ بڑی مشکل سے گاڑی دوسرے کنارے تک پہنچی۔ جو زخمی سوار گاڑی پر تھا اس کے زخم گاڑی کی تکان سے کھل گئے تھے۔ تمام گاڑی میں خون ہی خون تھا۔

ندی کے اس پار جا کے زخم پھر سے بندھے گئے۔ گاڑی دھوئی گئی۔ پھر میں گاڑی میں سوار ہوئی۔ اب قریب دوپہر کے دن آچکا تھا۔ مجھے شدت سے بھوک لگی ہوئی تھی۔ گاڑی اسی طرح چل رہی تھی۔ ان لوگوں کا ڈیرہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ندی سے کوئی چار کوس پر جا کے ایک گاؤں کے پاس باغ تھا، اس میں چھو لدا ریاں پڑی ہوئی تھیں، گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ لوگ ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ کچھ لوگ کھانا پکا رہے تھے۔ یہاں آ کر ہماری گاڑی رکی۔ ہمارے ساتھ کے سواروں کو دیکھتے ہی ایک آدمی اس پڑاؤ سے دوڑ کے آگے بڑھا۔ اس نے کچھ فضل علی کے کان میں کہا۔ فضل علی کے چہرے سے تشویش کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔ وہ فیض علی کے پاس گھوڑا بڑھا کے آئے، فیض علی سے چپکے چپکے باتیں ہوئیں۔

فیض علی: اچھا دیکھا جائے گا۔

فضل علی: کھانا کھانے تک کی مہلت نہیں ہے، ایسے میں نکل چلو۔

فیض علی: اچھا، جب تک چھو لدا ریاں اکھاڑی جائیں، گھوڑوں پر زین کسے جائیں، ہم لوگ کھانا کھالیں۔

میں گاڑی سے اتری۔ ایک آم کے درخت کے نیچے دری بچھا دی گئی، سالن کی پتیلیاں لا کے رکھی گئیں۔ تھئی کی تھئی روٹیاں موٹی موٹی ٹوکریوں میں آئیں۔ میں، فیض علی اور فضل علی تین آدمیوں نے مل کے کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے وقت اگرچہ چہروں پر تشویش کے آثار تھے۔ مگر ہلکی مذاق ہوتا جاتا تھا۔

جتنی دیر میں ہم لوگوں نے کھانا کھایا، چھو لدا ریاں اکھاڑ کے ٹوؤں پر لادی گئیں زین کے گئے۔ آخر قافلہ چل نکلا۔

دو ہی تین کوس گئے ہوں گے کہ بہت سے سوار اور پیدلوں نے آ کر گھیر لیا۔ ادھر بھی سب



پہلے سے مستعد تھے۔ دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں۔ اس لڑائی میں فیض علی میری گاڑی کے آس پاس رہے۔ میں گاڑی کے اندر بیٹھی دعائیں پڑھ رہی ہوں، کیجہ ہاتھوں اچھل رہا ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی گاڑی کا پردہ کھول کے دیکھ لیتی ہوں۔ یہ گرا وہ مرا۔ آخر دونوں طرف سے بہت سے زخمی ہوئے۔ ہمارے ساتھ پچاس ساٹھ آدمی تھے راجا شیو دھیان سنگھ کے آدمی بہت تھے۔ ایک پردس ٹوٹ پڑے بہت زخمی ہوئے۔ فضل علی اور فیض علی موقع پا کر نکل گئے۔ دس بارہ آدمی گرفتار ہوئے۔ انہی گرفتاروں میں میں بھی تھی۔

ہم لوگوں کی گرفتاری کے بعد گاڑی بان نے منت سماجت کر کے رہائی حاصل کی۔ زخمی سوار کو میدان میں ڈال دیا جہاں اور لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ تو اپنی جان لے کے رائے بریلی کی طرف روانہ ہوا۔ مردوں کی مشکلیں کسی گئیں، گڑھی کی طرف روانہ ہوئے۔ گڑھی وہاں سے کوئی چار پانچ کوس تھی۔ تھوڑی دور جا کے راجا صاحب اور ان کے ساتھ کے اور لوگ ملے۔ راجا صاحب گھوڑے پر سوار تھے۔ ہم لوگ سامنے گئے۔ میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

راجا: یہی بی لکھنؤ سے آئی ہیں؟

میں: (ہاتھ باندھ کے) حضور! قصور وار ہوں، لیکن اگر غور کیجیے تو ایسا

قصور بھی نہیں۔ عورت ذات، جعل فریب سے آگاہ نہیں۔ میں کیا جانتی تھی؟

راجا: اب اپنی بے قصوری ثابت کرنے کی کوشش نہ کیجیے۔ قصور آپ کا

ثابت ہے۔ جو باتیں آپ سے پوچھی جائیں ان کا جواب دیجیے۔

میں: جو حکم حاکم۔

راجا: لکھنؤ میں کہاں مکان ہے؟

میں: کسال کے پاس۔

راجا: جہاں خانم کا مکان ہے وہیں؟

میں: حضور وہیں۔

راجا: (آدمیوں کو اشارہ کر کے) دیکھو تخت کھڑے سے ایک بیل

گاڑی لے لو۔ لکھنؤ کی رٹیاں ہیں، ہمارے دیس کی پتیاں نہیں

ہیں کہ رات بھر محفل میں ناچیں اور برات کے ساتھ دس دس  
کوس تک ناچتی جائیں۔

میں: حضور کو خدا سلامت رکھے!

آدمی گئے کھڑے سے گاڑی لے آئے۔ مجھے گاڑی پر بٹھایا اور لوگ اسی طرح مشکیں کے  
ہوئے ساتھ ساتھ تھے۔

گڑھی پہنچ کر وہ لوگ نہیں معلوم کہاں بھیج دیئے گئے، میں کوٹ میں بلائی گئی، ستھرا مکان  
رہنے کو دیا گیا، دو آدمی خدمت کو مقرر ہوئے۔ پکا پکایا کھانا، پوریاں، کچوریاں، مٹھائیاں طرح طرح  
کے اچار کھانے کو۔ لکھنؤ کے چھوڑنے کے بعد آج رات کو کھانا سیر ہو کر کھایا۔ دوسرے دن صبح کو  
معلوم ہوا کہ اور قیدی لکھنؤ روانہ کر دیئے گئے۔ مجھ کو رہائی کا حکم ہے، مگر ابھی راجا صاحب رخصت  
نہیں کریں گے۔ پہر بھر دن چڑھے راجا صاحب نے بلا بھیجا۔

راجا: اچھا ہم نے تم کو رہا کیا۔ فیضو اور فضل علی دونوں بد معاش نکل  
گئے اور سب نابکار جو گرفتار ہوئے لکھنؤ میں پہنچ کر اپنی سزا کو  
پہنچیں گے۔ بے شک تمہارا کوئی قصور نہیں، مگر آئندہ ایسے  
لوگوں سے نہ ملنا، اگر تمہارا جی چاہے دو چار دن یہاں رہو۔ ہم  
نے تمہارے گانے کی بہت تعریف سنی ہے۔

میں: (نہیں کی وہ بات یاد آئی کہ راجا صاحب کے پاس لکھنؤ کی کوئی  
رنڈی ہے۔ ہونہ ہوا اسی نے میری تعریف کی ہوگی۔) حضور نے  
کس سے سنا؟

راجا: اچھا، یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد لکھنؤ کی وہ رنڈی طلب ہوئی۔ لکھنؤ کی وہ رنڈی کون؟ خورشید جان۔  
خورشید دوڑ کے مجھ سے لپٹ گئی۔ دونوں مل کے رونے لگیں۔ آخر راجا صاحب کے خوف سے فوراً  
علیحدہ ہو کر سامنے مودب بیٹھ گئیں۔ سازندے طلب ہوئے۔

رہائی کی خبر سن کے میں نے ایک حسب حال غزل کہہ لی تھی۔ بہت سے شعر تھے۔ جو شعر یاد  
آتے ہیں سنائے دیتی ہوں۔ ہر ایک شعر پر راجا صاحب اور حاضرین جلسہ بہت ہی مخطوط  
ہوئے۔ بے خودی کا عالم طاری تھا۔ غزل یہ ہے۔

قیدی الفت صیاد رہا ہوتے ہیں

خوش نوا یاں چمن زاد رہا ہوتے ہیں

تو بھی چھوڑے تو تری زلف نہ چھوڑے ہم کو

کوئی ہم اے ستم ایجاد رہا ہوتے ہیں

حسرت اے ذوق اسیری کہ خفا ہے صیاد

آج ہم بادل ناشاد رہا ہوتے ہیں

خاطر نازک صیاد کو برداشت نہیں

باعث نالہ و فریاد رہا ہوتے ہیں

غم دنیا نہ سہی اور ہزاروں غم ہیں

قید ہستی سے کب آزاد رہا ہوتے ہیں

کیوں نہ رشک آئے ہمیں تازہ گرفتاروں پر

ہم تو اے لذت بیداد رہا ہوتے ہیں

اے ادا قید محبت سے رہائی معلوم

کب اسیر غم صیاد رہا ہوتے ہیں

مقطع سن کے راجا صاحب نے پوچھا۔ ”ادا کس کا تخلص ہے؟“

خورشید نے کہا ”خود انہی کی کہی ہوئی ہے“ راجا اور بھی خوش ہوئے۔

راجا: اگر ایسا جانتے تو ہم آپ کو ہرگز رہا نہ کرتے۔

میں: غزل سے حضور کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اسی کا تو افسوس ہے مگر اب

تو حضور حکم دے چکے اور لونڈی آزاد ہو چکی۔

اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ راجا صاحب اندر رسوئی کھانے چلے گئے خورشید کی محو

سے خوب باتیں ہوئیں۔

خورشید: دیکھو بہن! میرا کوئی قصور نہیں۔ خانم صاحب سے اور راجا صاحب سے بہت دنوں سے لاگ وانٹ تھی۔ راجا صاحب نے کئی مرتبہ مجھے بلوایا، انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ آخر عیش باغ کے میلے میں ان کے آدمی لگے ہوئے تھے، مجھ کو زبردستی اٹھا لائے۔ جب سے یہیں ہوں، ہر طرح کی میری خاطر ہوتی ہے، سب طرح کا آرام ہے۔

میں: موئے گنواروں میں خوب تمہارا جی لگتا ہے۔

خورشید: یہ بات تو سچ ہے۔ مگر تم میری طبیعت کو جانتی ہو۔ روز ایک نئے شخص کے پاس جاؤ، میرے بالکل خلاف ہے۔ وہاں یہی کرنا پڑتا تھا۔ خانم کو جانتی ہو۔ یہاں صرف راجا صاحب سے سابقہ ہے اور سب میرے حکم کے تابع ہیں۔ دوسرے یہ میرا وطن ہے۔ یہاں کی ہر چیز مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے۔

میں: تو تمہارا ارادہ لکھنو جانے کا نہیں ہے؟

خورشید: مجھے تو معاف کرو۔ یہاں اچھی طرح ہوں، بلکہ تم بھی یہیں رہو۔

میں: میں یہاں تو نہ رہوں گی، مجبوری کی اور بات ہے۔

خورشید: لکھنو جاؤ گی؟

میں: نہیں۔

خورشید: پھر کہاں؟

میں: جہاں خدا لے جائے۔

خورشید: ابھی کچھ دنوں رہو۔

میں: ہاں ابھی تو ہوں۔

پندرہ بیس دن تک میں گڑھی میں رہی، خورشید سے روزانہ ملتی تھی۔ خورشید کا دل وہاں لگا ہوا تھا۔ میرا جی بہت گھبراتا تھا۔ آخر راجا صاحب سے میں نے عرض کیا۔

میں: حضور نے مجھے حکم رہائی دیا ہے؟

راجا: ہاں! تو پھر کیا جانا چاہتی ہو؟



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : [www.igbalkalmati.blogspot.com](http://www.igbalkalmati.blogspot.com)

لگا۔ پہلے میرا حال پوچھا اس کے بعد میں نے فیض علی کا حال پوچھا۔ اس نے کہا ”ان کو آپ کے اناؤ آنے کی خبر مل گئی ہے آج رات کو پہر ڈیڑھ پہر رات گئے ضرور آ جاویں گے“

یہ سن کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے اب فیض علی کا ساتھ منظور نہ تھا۔ تخت کھڑے کے واقعے کے بعد میں سمجھتی تھی کہ اب گلو خلاصی ہو گئی ہے۔ اناؤ میں فیض علی کے ملنے کا مان گمان تک نہ تھا۔ میں نے دل میں کہا لو پھر آفت کا سامنا ہوا دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ فیض علی میری جان نہ چھوڑیں گے۔ رات کو ڈیڑھ پہر رات گئے فیض علی جان پر نازل ہو گئے۔ معمولی بات چیت کے بعد اناؤ سے روانگی کا مشورہ ہونے لگا۔ بڑی دیر تک باتیں رہیں۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ گاڑی سلا رو بھٹیاریے کے پاس چھوڑ دو راتوں رات گنگا کے اس پار اتر چلو۔ اب کیا کر سکتی تھی۔ فیض علی کے بس میں تھی۔ جو انہوں نے کہا چارونا چار منظور کرنا پڑا۔ فیض علی نے سلا رو کو بلایا کنارے لے جا کے دیر تک باتیں کیں۔ کوئی آدمی رات گئے اپنے ساتھ مجھے گھوڑے پر بٹھایا سرائے سے باہر ہوئے۔ پانچ چھ کوس زمین کا چلنا رات کا وقت میرا بند بند ٹوٹ گیا۔ مدتوں در در رہا۔ آخر جوں توں کر کے گنگا کے کنارے پہنچے۔ بڑی مشکل سے ناؤ تلاش کی اس پار اترے فیض علی نے کہا ”اب کوئی خوف نہیں ہے۔“ صبح ہوتے ہوتے کانپور پہنچ گئے۔ فیض علی نے مجھ کو لاٹھی محال کی سرائے میں اتارا خود مکان کی تلاش میں نکلے۔ تھوڑی دیر کے بعد آ کے کہا۔ ”یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے مکان ہم نے ٹھہرا لیا ہے وہاں چلی چلو۔“ ڈولی کرایہ پر کی۔ تھوڑی دیر میں ڈولی ایک پختہ عالی شان مکان کے دروازے پر ٹھہری۔ فیض علی نے ہم کو یہاں اتارا۔ مکان کے اندر جا کے کیا دیکھتی ہوں کہ ایک دالان میں دو کھری چار پایاں پڑی ہیں۔ ایک چٹائی بچھی ہوئی ہے اس پر ایک عجیب قطع کا حقہ رکھا ہوا ہے جسے دیکھتے ہی پینے سے مجھے نفرت ہو گئی۔ مکان کا قرینہ دیکھ کے دل کو وحشت ہونے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد فیض علی نے کہا ”اچھا تو میں بازار سے کچھ کھانے کو لے آؤں۔“ میں نے کہا ”بہتر“ مگر ذرا جلدی آنا۔“ فیض علی بازار کو گئے میں اسی مکان میں اکیلی بیٹھی ہوں۔

اب سینے فیض علی بازار کو گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ نہ آج آتے ہیں نہ کل۔ ایک گھڑی دو گھڑی پہر دو پہر کہاں تک کہوں۔ دو پہر گزری شام ہونے کو آئی۔ اناؤ میں سرشام کھانا کھایا تھا رات کو گھوڑے پر چلنے کی تکان نیند کا خمار صبح سے منہ پر چلو پانی تک نہ پڑا۔ ٹکڑا تک نہیں کھایا بھوک کے مارے دم نکلا جاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں سورج ڈوب گیا اندھیرا ہونے لگا۔ آخر رات

ہو گئی۔ یا خدا اب کیا کروں۔ منہ کھول دیا، اٹھ بیٹھی۔ اتنا بڑا ڈھنڈا مکان بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ ہیہات خدا کی ذات اور میں اکیلی۔ یہ معلوم ہوتا تھا اب اس کوٹھری سے کوئی نکلا وہ سامنے والے دالان میں کوئی ٹہل رہا ہے۔ کوٹھے سے دھم دھم کی آواز آئی، زینے سے کوئی کھٹ کھٹ اترتا چلا آتا ہے۔ دوپہر رات ہو گئی۔ اب تک انگنائی اور دیواروں پر چاندنی تھی، اب چاند بھی چھپ گیا، بالکل اندھیرا گھپ ہو گیا۔ آخر میں دو شالے سے منہ لپیٹ کے پڑ رہی۔ پھر کچھ کھٹکا ہوا۔ رات پہاڑ ہو گئی۔ کالے نہیں کنتی ہے۔ آخر جوں توں کر کے صبح ہوئی۔

دوسرے دن صبح کو تو عجب ہی عالم تھا۔ اب لکھنؤ کی قدر ہوئی۔ دل میں کہتی تھی یا خدا کس مصیبت میں جان پڑی، لکھنؤ کا عیش چین اور اپنا کمر یاد آتا تھا، ادھر ایک آواز دی ادھر آدمی مستعد۔ حقہ پان، کھانا، پانی، جو کچھ ہوا ادھر منہ کیا ادھر سامنے موجود۔ خلاصہ یہ کہ آج بھی صبح سے دوپہر ہو گئی۔ اور فیض علی نہ آئے۔ اس حالت میں اگر کوئی نیک بخت بی بی چار دیواری کی بیٹھنے والی ہوتی تو ضرور گھٹ گھٹ کے مرجاتی۔ میرا ہواؤ تو کھلا ہوا نہ تھا۔ مگر پھر بھی سینکڑوں مردوں میں بیٹھ چکی تھی۔ کانپور نہ سہی لکھنؤ کے اکثر گلی کوچوں سے واقف۔ یہاں کی بھی سرادیکھی تھی، بازار دیکھا تھا۔ اب میری بلا اس خالی مکان میں بیٹھی رہتی۔ جھپ سے کنڈی کھول گلی میں نکل کھڑی ہوئی۔ گھر سے دس بیس قدم گئی ہوں گی کہ دیکھتی کیا ہوں کہ ایک شخص سرکاری وردی پہنے، گھوڑے پر سوار دس پندرہ برق انداز ساتھ ان کے حلقے میں میاں فیض علی ٹنڈیاں کسی ہوئیں، سامنے سے چلے آتے ہیں۔ یہ ماجرا دیکھتے ہی میں سن سے ہو گئی، وہیں ٹھٹک گئی، ایک ایک قدم سو سو من کا ہو گیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ ان لوگوں میں سے کسی کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی۔ وہ نکلے ہوئے چلے گئے میں ایک گلی میں ہو رہی۔ تھوڑی دور جا کے ایک پتلی سی گلی ملی۔ اسی گلی میں ایک مسجد تھی۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ سب سے بہتر خدا کا گھر ہے، تھوڑی دیر یہیں جا کے ٹھہرنا چاہئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، میں درانا اندر چلی گئی۔ یہاں ایک مولوی صاحب سے سامنا ہوا۔ کالے سے تھے۔ سر منڈا ہوا تھا۔ ایک نیلی تہد باندھے دھوپ میں ٹہل رہے تھے۔ پہلے تو شاید سمجھے میں طاق بھرنے آئی ہوں، بہت ہی خوش ہوئے۔ جب میں جا کے چپکے محن کے کنارے پاؤں لٹکا کے بیٹھ گئی تو قریب آ کے پوچھنے لگے ”کیوں بی صاحب! آپ کا یہاں کیا کام ہے؟“

میں: میں مسافر ہوں، خدا کا گھر سمجھ کے تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ گئی

ہوں۔ اگر آپ کو ناگوار ہو تو ابھی چلی جاؤں۔

۱۲۰ — امر او جان ادا

مولوی صاحب اگر چہ بہت ہی بے تکے تھے مگر میری لگاوٹ کی نظر اور دل فریب تقریر نے جادو کا اثر کیا۔ بھلا جواب کیا منہ سے نکلتا، ہکا بکا ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ میں سمجھ گئی کہ دام میں آگئے۔

مولوی: (تھوڑی دیر کے بعد بہت سنبھل کے) اچھا تو آپ کا کہاں سے آنا ہوا؟

میں: جی کہیں سے آنا ہوا، مگر بالفعل تو یہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔

مولوی: (بہت ہی گھبرا کے) مسجد میں؟

میں: جی نہیں، بلکہ آپ کے حجرے میں۔

مولوی: لاحول ولا قوۃ!

میں: اوکی مولوی صاحب! مجھے تو آپ کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

مولوی: جی ہاں، تو میں اکیلا تو رہتا ہوں، اسی لیے تو میں نے کہا مسجد میں آپ کا کیا کام ہے۔

میں: یہ کیا..... خاصیت ہے کہ جہاں آپ رہتے ہیں وہاں دوسرا نہیں رہ سکتا۔ مسجد میں ہمارا کچھ کام نہیں، یہ خوب کہی! آپ کا کیا کام ہے؟

مولوی: میں تو لڑکے پڑھاتا ہوں۔

میں: میں آپ کو سبق دوں گی۔

مولوی: لاحول ولا قوۃ۔

میں: لاحول ولا قوۃ؟ یہ آپ ہر دفعہ لاحول کیوں پڑھتے ہیں۔ یہ کیا

شیطان آپ کے پیچھے پڑا ہے؟

مولوی: شیطان آدمی کا دشمن ہے اس سے ہر وقت ڈرنا چاہئے۔

میں: خدا سے ڈرنا چاہئے، موئے شیطان سے کیا ڈرنا اور یہ کیا آپ

نے کہا آپ آدمی ہیں؟

مولوی: (ذرا بگڑ کے) جی ہاں اور کون ہیں؟

میں: مجھے تو آپ جن معلوم ہوتے ہیں، اکیلے اس مسجد میں رہتے



ہیں۔ آپ کا دل بھی نہیں گھبراتا؟

مولوی: پھر کیا کریں، ہمیں تو اکیلے کی عادت ہے۔

میں: اسی سے تو آپ کے چہرے پر وحشت برستی ہے۔ وہ آپ نے نہیں سنا۔

تنہا منشی کہ نیم دیوانگی است

مولوی: اجی وہ کچھ سہی۔ جس حال میں ہم ہیں خوش ہیں، آپ اپنا مطلب کہیے؟

میں: مطلب تو کتاب کے دیکھنے سے حل ہوگا، بالفعل زبانی مباحثہ ہے۔

مولوی: چہ خوش!

میں: چہ ابا شد۔

میں مولوی صاحب کو خوب جھنجھوڑیاں دیتی، مگر اس وقت بھوک کے مارے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔

رسوا: یہ مولوی صاحب سے اس قدر مذاق کی کیا ضرورت تھی؟

امراؤ: اے ہے اس کا حال نہ پوچھو۔ بعض آدمیوں کی صورت ہی ایسی ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔

رسوا: جی ہاں، جیسے کسی کی منڈی ہوئی کھوپڑی دیکھ کے بعض آدمیوں کی ہتھیلی کھجلاتی ہے، چپت لگانے کو جی چاہتا ہے۔

امراؤ: بس یہی سمجھ لیجیے۔

رسوا: اچھا تو وہ مولوی صاحب میں ایسی کون سی بات تھی جس سے

مذاق کرنے کو جی چاہتا تھا؟

امراؤ: کیا کہوں، کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ جوان آدمی تھے، صورت بھی

کچھ بری نہ تھی۔ سالواری رنگت تھی، چہرے پر حلق پن تھا۔ سر پر

لبے لبے بال تھے، منہ پر داڑھی تھی، مگر کچھ بے تکے پن کی حد

سے بڑھی ہوئی۔ مونچھوں کا بالکل صفایا تھا۔ تہہ بہت اونچی

بندھی ہوئی تھی۔ سر پر چھینٹ کی بڑی سی ٹوپی تھی جو سر کی پوری چوحدی ڈھانکے ہوئے تھی۔ بات کرنے کا عجیب انداز تھا۔ منہ جلدی سے کھلتا تھا، پھر بند ہو جاتا تھا۔ نیچے کا ہونٹ کچھ عجیب انداز سے اوپر کو چڑھ جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی نکلے دار واڑھی کچھ عجیب انداز سے ہل جاتی تھی۔ اس کے بعد ناک سے کچھ ہونہرہ سا نکلتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ کھا رہے ہیں اور باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ احتیاطاً منہ جلدی سے بند کر لیتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کچھ نکل پڑے۔

کیا واقعی کچھ کھا رہے تھے؟

رسوا:

جی نہیں، جگالی کر رہے تھے۔

امراؤ:

اکثر کٹ ملا کچھ ایسی ہی صورت بنا لیتے ہیں جسے دیکھ کے بے وقوفوں کو ڈر لگتا ہے اور عقل مندوں کو ہنسی آتی ہے۔ مجھے ایسی صورتیں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔

رسوا:

اور سنے، آپ کی گفتگو میں ایک وصف اور بھی تھا، وہ یہ کہ اکثر منہ پھیر لیا کرتے تھے۔

امراؤ:

یہ تو عین تمیز داری ہے، اس لیے کہ عند التقریر آپ کے منہ سے تھوک اڑتا ہوگا۔

رسوا:

کچھ اور بھی عرض کروں؟

امراؤ:

بس اب معاف کیجیے، یہاں تو صبح ہو گئی۔

رسوا:

القصہ میں نے جیب سے ایک روپیہ نکالا۔

امراؤ:

(یہ سمجھ کے کہ مجھے نذر دیا جاتا ہے، جلدی سے ہاتھ تو بڑھا دیا اور

مولوی:

منہ سے) ”اس کی کیا ضرورت تھی۔“

(مسکرا کے) اس کی اشد ضرورت تھی، اس لیے کہ مجھے بھوک لگی

میں:

ہے، کسی سے کچھ کھانے کو منگا دیجیے؟

(اب جھینپے تو یوں باتیں بنانے لگے) میں سمجھا۔ (میں نے دل

مولوی:

میں کہا سمجھے کیا خاک سمجھتے تو پتھر کے ہو جاتے) اسی لیے تو کہتا ہوں اس کی کیا ضرورت تھی۔ کیا کھانا یہاں ممکن نہیں ہے؟

امکان بالقوہ یا بالفعل بالذات یا بالغیر؟

میں:

بالفعل تو ممکن نہیں۔ میرا ایک شاگرد کھانا لاتا ہوگا، آپ بھی کھا لیجیے گا۔

مولوی:

بالفعل تو ممکن نہیں، بالذات کی آپ کو توفیق نہیں، اور یہاں ضرورت نے اکل میت کو جواز کا حکم دے دیا ہے لہذا بازار سے کچھ لاد دیجیے۔

میں:

اب ذرا صبر کیجیے۔ کھانا آتا ہی ہوگا۔

مولوی:

اب صبر کرنا تکلیف مالا یطاق ہے۔ اور دوسرے میں نے بالتحقیق سنا ہے کہ رمضان شریف ایک مہینے تمام دنیا میں سیر کرتے ہیں اور گیارہ مہینے اسی مسجد میں معتکف رہتے ہیں۔

میں:

اس وقت تو فی النفس الامر میں کچھ نہیں ہے مگر میرا ایک شاگرد کھانا لے کے آتا ہوگا۔

مولوی:

اور بفرض والتسلیم لو کان حالا اگر کھانا آیا بھی تو وہ آپ کی قوت لایموت کے لیے بھی کافی نہ ہوگا، میری شرکت اس میں یعنی چہ؟ اور من وجہ کفالت بھی کرے تو الانتظار اشد من الموت کا مضمون ہے۔ تا تریاق از عراق آوردہ شود.....

میں:

آہا، آپ تو بہت قابل معلوم ہوتی ہیں۔

مولوی:

مگر میرے ذمہ ناقص میں آپ کسی قابل نہیں۔

میں:

واقع ایسا ہی ہے، مگر.....

مولوی:

(بات کاٹ کر) مگر اس لیے کہ یہاں تو آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں اور آپ لا طائل تقریریں کر رہے ہیں۔

میں:

اچھا تو میں ابھی لایا۔

مولوی:

لہذا جلدی لائیے۔

میں:

خدا خدا کر کے مولوی صاحب گئے اور کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد چار خمیری روٹیاں اور ایک مٹی کے پیالے میں تھوڑا سا نیلا شوربالا کے میرے سامنے رکھ دیا۔ دیکھ کے جان جل گئی۔ مولوی صاحب کی صورت دیکھنے لگی۔ مولوی صاحب اپنے دل میں کچھ اور جی سمجھے۔  
 (نورا ساڑھے چودہ گنڈے پیسے کوئی دھیلے کی کوڑیاں چادر کے کونے سے کھول کر سامنے رکھ دیئے) سنئے صاحب! چار پیسے کی روٹیاں ہیں، پیسے کا سالن ہے، دھیلا بھانج (روپے کا خوردہ) میں گیا، آپ کی جمع آپ کے سامنے موجود ہے۔ پہلے گن لیجیے تو کھا لیجیے گا۔

میں نے پھر ایک دفعہ مولوی صاحب کی صورت دیکھی مگر بھوک بری بلا ہے، جلدی جلدی نوالے اٹھانا شروع کیے۔ جب دو چار نوالے کھا چکی تو مولوی صاحب کی طرف مخاطب ہوئی۔  
 میں: میں نے کہا مولوی صاحب! کیا اس اجڑے شہر میں یہی کھانے کو ملتا ہے؟

مولوی: تو کیا یہاں لکھنؤ کی طرح محمود کی دکان ہے جہاں پلاؤ زردہ آٹھ پہر تیار رہتا ہے؟

میں: حلوائی کی دکان تو ہوگی؟

مولوی: حلوائی کی دکان یہ مسجد کے نیچے ہے۔

میں: تو پھر چار کوشن جانا کیا ضرور تھا۔ دوپہر کے بعد آئے اور لے

کے کیا آئے۔ موئے کتوں کا راتب۔

مولوی: ایسا تو نہ کہیے۔ آدمی کھاتے ہیں۔

میں: آپ ایسے آدمی کھاتے ہوں گے۔ باسی خمیری روٹیاں اور نیلا

نیلا شوربالا!

مولوی: نیلا تو نہیں ہے۔ اچھا تو وہی لادوں؟

میں: جی نہیں رہے دیجئے معاف کیجیے۔

مولوی: پیسے کا خیال نہ کیجیے، میں اپنے پاس سے لائے دیتا ہوں۔

میں کچھ جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ مولوی صاحب مسجد سے باہر چلے گئے۔ اور ایک آب



خورے میں خدا جانے کب کا سڑا ہوا کھٹا دہی اٹھالائے اور اس طرح سامنے لا کے رکھ دیا گویا آپ نے حاتم کی قبر پر لات ماردی۔

بہر طور میں نے وہ چار روٹیاں اگل نگل کے کھائیں اور کوئی بدھنی بھر کے پانی پیا۔ وہ شوربا اور دہی یوں ہی چھوڑ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پیسے کوڑیاں بھی وہیں پڑی رہنے دیئے۔ میں ہاتھ دھونے اٹھی تھی، مولوی صاحب سمجھے مسجد سے دفان ہوتی ہے۔

مولوی: اور یہ پیسے اور کوڑیاں تو اٹھا لیجیے۔

میں: میری طرف سے مسجد میں چراغی چڑھا دیجیے۔

منہ ہاتھ دھو کے اپنی جگہ پر آ بیٹھی، مولوی صاحب سے باتیں کرنے لگی۔

کان پور میں مولوی صاحب کی ذات سے مجھے بہت آرام ملا۔ انہی کی معرفت ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ نواڑی پٹنگ، درمی، چاندنی، چھت، پردے، تانبے کے برتن اور سب ضروریات کا سامان خرید لیا۔ ایک ماما کھانے پکانے کو اور ایک اوپر کے کام کاج کو دو اور خدمت گار نو کر رکھ لیے، ٹھاٹھ سے رہنے لگی۔ اب سازندوں کی تلاش ہوئی۔ یوں تو بہت سے آئے مگر کسی کا باج پسند نہ آیا۔ آخر لکھنؤ کا ایک طبلیہ مل گیا۔ یہ خلیفہ جی کے خاندان کا شاگرد تھا۔ اس سے خوب پرگت ملی۔ اسی کی معرفت دوسار نیگے کان پور کے ذرا سمجھ دار تھے بلوائے۔ طائفہ درست ہو گیا۔ شب کو پہر ڈیڑھ پہر رات گئے تک کمرے پر گانے بجانے کا چرچا رہنے لگا۔ شہر میں یہ خبر مشہور گئی کہ لکھنؤ سے کوئی رنڈی آئی ہے۔ اکثر مرد آدمی آنے لگے۔ شاعری بھی خوب چمکی۔ کوئی دن ایسا ہی کم بخت ہو گا جو کسی جلسے میں جانا نہ ہوتا ہو۔ مجرے کثرت سے آتے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں بہت سا روپیہ کما لیا۔ اگرچہ کان پور کے لوگوں کا راہ رویہ بول چال مجھے پسند نہ تھی، بات بات پر لکھنؤ یاد آتا تھا، مگر خود مختاری کی زندگی میں کچھ ایسا مزا ہے کہ واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر لکھنؤ جاؤں گی تو پھر خانم کی نوچی بن کے رہنا پڑے گا، کیوں کہ اس پیشے میں رہ کر لکھنؤ میں خانم سے علیحدہ رہنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ ایک تو اس سبب سے کہ تمام رنڈیاں خانم کا دباؤ مانتی تھیں۔ اگر میں الگ ہو کے رہتی تو کوئی مجھ سے نہیں ملتی۔ دوسرے عمدہ سازندوں کا بہم پہنچنا دشوار تھا۔ ناچ مجرے کا ڈھچھر کیوں کر چل سکتا تھا۔ جن سرکاروں میں میری رسائی ہوئی تھی وہ بھی خانم کی وجہ سے تھی۔ اگرچہ میرا شمار اچھے گانے والیوں میں تھا، مگر لکھنؤ میں اس کام کے کرنے والے بہت سے ہیں۔ اچھے برے کا امتیاز خاص لوگوں کا ہوتا ہے، عام لوگوں میں نام بکتا ہے۔ بڑے آدمیوں کی نگاہ

اکثر اونچے ہی کمروں پر جاتی ہے۔ اس حالت میں مجھے کون پوچھتا۔ کان پور میں میرے حوصلے سے زیادہ میری قدردانی ہوتی تھی۔ کسی امیر رئیس کے ہاں کوئی تقریب شادی بیاہ کی نہ ہوتی تھی جس میں میرا بلانا باعث فخر نہ سمجھا جاتا ہو۔ باہر جا کر اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ لکھنؤ کیا چیز ہے۔ یہاں ایک صاحب حضرت شارق لکھنوی بہت مشہور ہیں۔ استاد مسلم الثبوت سمجھے جاتے ہیں۔ سینکڑوں آپ کے شاگرد ہیں۔ لکھنؤ میں کوئی ان کا نام بھی نہ جانتا ہوگا۔ ایک دن کا تذکرہ سنئے۔ ایک صاحب میرے کمرے میں تشریف لائے۔ اثنائے گفتگو میں شعر و شاعری کا کچھ چرچا نکلا۔ چھوٹے ہی انہوں نے پوچھا ”آپ حضرت شارق لکھنوی کو جانتی ہیں؟“ میں نے کہا ”نہیں۔ کون حضرت شارق؟“ یہ صاحب ان کے شاگردوں میں تھے فوراً بگڑ گئے۔

وہ صاحب: میں تو سنتا تھا آپ لکھنوی رہنے والی ہیں؟

میں: جی ہاں غریب خانہ تو لکھنؤ میں ہی ہے۔

وہ صاحب: بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ لکھنؤ میں ہوں اور حضرت استاد کو نہ جانیں۔

میں: لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں کون ایسا نہ ہے جس کو میں نہ جانتی ہوں۔ استادوں کا تو ذکر ہی کیا ہے ان کے نام برا آوردہ شاگردوں میں سے بھی کوئی کم ایسا ہوگا جس کا کلام میں نے نہ سنا ہو۔ ان کا نام نامی سے تو مطلع فرمائیے۔ یہ تخلص تو میں نے کبھی سنا نہیں۔

وہ صاحب: (چہیں بہ جہیں ہو کے) نام لینے سے کیا فائدہ! تخلص شرق سے غرب اور شمال سے جنوب تک زبان زد خلایق ہیں۔ ہاں اک آپ نہیں جانتیں نہ جانیں!

میں: حضور معاف کیجیے گا میرے نزدیک تو یہ شاعرانہ تعلیٰ ہے۔ مگر آپ کے استاد ہیں آپ کو ایسا ہی کہنا چاہئے۔ اچھا تو نام نامی سے تو مطلع فرمائیے۔ ممکن ہے کہ میں نے تخلص نہ سنا ہو نام سے واقف ہوں۔

وہ صاحب: میر ہاشم علی صاحب شارق۔

میں: اس نام سے تو بے شک کان آشنا ہیں۔ (اتنا کہہ کے اب میں فکر کرنے میں لگی۔ یا الہی یہ کون میرا شمع علی صاحب ہیں۔ آخر ایک صاحب پر اشتباہ ہوا) آپ کے استاد مرثیہ خوانی بھی تو کرتے ہیں؟

وہ صاحب: جی ہاں، مرثیہ خوانی میں بھی ان کا مثل و نظیر نہیں۔

میں: بجا ارشاد ہوا، یعنی میرا صاحب اور مرزا صاحب سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔

وہ صاحب: انہی صاحبوں کے ہمسر ہیں۔

میں: بھلا کس کا مرثیہ پڑھتے ہیں؟

وہ صاحب: کسی کا مرثیہ کیوں پڑھنے لگے، خود تصنیف فرماتے ہیں۔ ابھی

ستائیسویں رجب کو نیا مرثیہ پڑھا تھا، تمام شہر میں شہرہ ہے۔

میں: مطلع تو آپ کو یاد ہوگا؟

وہ صاحب: مطلع تو نہیں، تلوار کی تعریف میں ایک بند پڑھا تھا، وہ مجھے کیا

تمام شہر کی زبان پر ہے۔ قلم توڑ دیا ہے۔

میں: ذرا ارشاد کیجیے گا، میں بھی مستفید ہوں۔

وہ صاحب: نکلی غلاف نور سے تفسیر جوہری۔

میں: سبحان اللہ! اس بند کے تو دور دور شہرے ہیں۔ پانچ مصرعے مجھ

سے سن لیجئے واقعی کیا کلام ہے!

وہ صاحب: (بہت ہی خوش ہو کے) جی ہاں، آپ نے یہ مرثیہ لکھنو میں سنا

ہوگا۔ وہی تو میں کہتا تھا کہ لکھنو کی رہنے والی اور پھر شعر و سخن کا

شوق، حضرت شارق کو نہ جانتی ہوں، تعجب ہے۔ اب میں سمجھا

یہ مذاق تھا۔

میرے جی میں آیا کہہ دوں کہ آپ کے استاد مر کے بھی جنیں گے تو ایسا بند نہیں کہہ سکتے۔

مرزا دبیر (مرحوم) کا کلام ہے، مگر پھر کچھ سمجھ کے چپ ہو رہی۔

رسوا: واقعی آپ نے بڑی عقل مندی کی، ورنہ بے چارے کی روزی

میں خلل آتا۔ میرا شرم علی صاحب شارق پر کیا موقوف ہے، اکثر صاحبوں کا یہی شعار ہے۔ دوسروں کا کلام باہر جا کے اپنے نام سے پڑھتے ہیں۔ چند ہی روز کا ذکر ہے ایک صاحب میرے ایک دوست کی غزلوں کے مسودے چرا کے لے گئے، حیدر آباد دکن میں سناتے پھرے۔ بڑے بڑے لوگوں سے داد لی، مگر سمجھنے والے سمجھ گئے۔ لکھنؤ سے خطوط آئے۔ اصل مصنف سے تذکرہ ہوا۔ وہ ہنس کے چپ ہو رہے۔ اکثر صاحبوں نے لکھنؤ کو ایسا بدنام کیا ہے کہ اب لفظ لکھنوی اپنے نام یا تخلص کے ساتھ لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ایسے ایسے بزرگ لکھنوی لکھتے ہیں جن کی ہفتاد پشت دیہات میں گزر گئی، خود لکھنؤ میں چند روز طالب علمی یا اور کسی سلسلے سے آ کر رہے، چلیے اچھے خاصے لکھنوی بن گئے۔ اگرچہ یہ کچھ ایسی فخر کی بات نہیں مگر جھوٹ سے کیا فائدہ۔

امراؤ: جی ہاں، اکثر صاحب اسی طرح لکھنؤ فروشی کر کے اپنا بھلا کرتے ہیں۔ کانپور میں میرا بھی ٹھیک یہی حال تھا۔ اس زمانے میں ریل تو تھی نہیں اور نہ لکھنؤ سے کوئی باہر جاتا تھا، بلکہ ہر شہر کے کالین تلاش معیشت میں یہیں آتے تھے، اپنے کمال کی حسب حیثیت داد پاتے تھے۔ وہلی اجڑ کے لکھنؤ آباد ہوا تھا۔

رسوا: فی زمانہ یہی حال دکن کا بھی ہے۔ لکھنؤ اجڑ کے دکن آباد ہوا ہے۔ میں تو گیا نہیں، مگر سنا ہے کہ محلے کے محلے لکھنؤ والوں سے آباد ہیں۔

امراؤ: جو صاحب لکھنوی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان سے کہیے پہلے اپنی زبان کی موج نکالیں۔

رسوا: کیا خوب بات کہی ہے ادا قتی روز مرہ تو کسی قدر آ بھی جاتا ہے، مگر لہجہ نہیں آتا۔



اتفاقات زمانہ سے یہ کچھ دور نہیں

یوں بھی ہوتا ہے کہ پھڑے ہوئے مل جاتے ہیں

پھڑے ہوئے مل جاتے ہیں اور پھر کب کے پھڑے ہوئے؟ وہ جن کے ملنے کا سان و گمان بھی نہ ہو۔ ایک دن کا واقعہ سنئے۔ کانپور میں رہتے ہوئے کوئی چھ مہینے گزر گئے ہیں۔ اب شہرت کی یہ حد پہنچی ہے کہ بازاروں اور گلیوں میں میری گائی ہوئی غزلیں لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ شام کو میرے کمرے میں بہت اچھا مجمع رہتا ہے۔ گرمیوں کے دن ہیں، کوئی دو بجے کا وقت ہوگا، میں اپنے پلنگ پر اکیلی لیٹی ہوں۔ سہ ماہی اور چچی خانے میں خراٹے لے رہی ہے۔ ایک خدمت گار کمرے کے باہر بیٹھا پنکھے کی ڈوری ہلچل رہا ہے۔ خس کی ٹٹیاں خشک ہو گئیں ہیں۔ میں آدمی کو آواز دیا، چاہتی تھی کہ پانی چھڑک دے کہ اتنے میں کمرے کے نیچے کسی نے آ کر پوچھا ”لکھنو سے جو رنڈی آئی ہے اس کا کمرا یہی ہے؟“ درگاہ بنے (جس کی دکان نیچے تھی) نے جواب دیا، ”ہاں یہی ہے۔“ پھر دریافت کیا، ”دروازہ کہاں ہے؟“ اس نے بتا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بڑی بی کوئی ستر برس کا سن، گوری سی منہ پر جھریاں پڑی ہوئیں، بال جیسے روئی کا گالا، کمر جھکی ہوئی، سفید ململ کا دوپٹہ تن زیب کا کرتا، نین سکھ کا پاشجامہ بڑے بڑے پانچوں کا پہنے ہاتھوں میں چاندی کے موٹے موٹے کڑے انگلیوں میں انگوٹھیاں، جزیب ہاتھ میں ہانپتی کانپتی ہوئی آئیں اور سامنے فرش پر بیٹھ گئی۔ ایک کالا سا لڑکا کوئی دس بارہ برس کا ان کے ساتھ تھا۔ وہ کھڑا رہا۔

بڑی بی: لکھنو سے تمہی آئی ہو؟

میں: جی ہاں!

اتنا کہہ کے میں پلنگ سے نیچے اتر آئی، پان دان آگے کھسکایا، آدمی کو حقے کے لیے آواز دی۔

بڑی بی: ہماری بیگم نے تمہیں یاد کیا ہے۔ لڑکے کی سالگرہ ہے۔ زنانہ

جلسہ ہوگا۔ تمہارا بچہ کیا ہے؟

میں: بیگم صاحب مجھ کو کیا جانیں؟

بڑی بی: اے تمام شہر میں تمہارے گانے کی دھوم ہے۔ دوسرے تمہارے  
بلا نے کا یہ بھی ایک سبب ہے کہ بیگم صاحب خود بھی لکھنؤ کی رہنے  
والی ہیں۔

میں: اور آپ بھی تو لکھنؤ کی ہیں؟

بڑی بی: تم نے کیوں کر جانا؟

میں: کہیں بات چیت کا قرینہ چھپا رہتا ہے۔

بڑی بی: ہاں میں بھی وہیں کی رہنے والی ہوں۔ اچھا تو اپنا بھرا تو بتاؤ  
ابھی بہت کام پڑا ہے۔

میں: بھرا تو میرا کھلا ہے۔ سب جانتے ہیں پچاس روپے لیتی ہوں۔

مگر بیگم صاحب لکھنؤ کی رہنے والی ہیں اور انہوں نے قدر کر کے  
بلایا ہے تو ان سے کچھ نہ لوں گی۔ جلسہ کب ہے؟

بڑی بی: آج شام کو اچھا تو یہ روپیہ کچھڑی کا تو لو۔ باقی وہاں آ کے سمجھ  
لینا۔

میں: (روپیہ لے لیا) اس کی کوئی ضرورت نہ تھی مگر اس خیال سے کہ  
بیگم صاحب برا نہ مانیں روپیہ لئے لیتی ہوں۔ اچھا اب کہیے کہ  
مکان کہاں ہے؟

بڑی بی: مکان تو ذرا دور ہے۔ نواب گنج میں ہے یہ لڑکا سر شام آئے گا  
اسی کے ساتھ چلی آنا۔ مگر اتنا خیال رہے کہ کوئی مرد ذات  
تمہارے ملنے والوں میں سے تمہارے ساتھ نہ ہو۔

میں: اور سازندے؟

بڑی بی: سازندے خدمت گاران کی منہا ہی نہیں ہے کوئی اور نہ ہو۔

میں: جی نہیں یہاں میرا کون ایسا ملاقاتی ہے جسے ساتھ لاؤں گی  
خاطر جمع رکھیے۔

اتنے میں خدمت گار نے حقہ تیار کیا۔ میں نے اشارہ کیا بڑی بی کے سامنے لگا دو۔ بڑی بی  
مزے لے لے کے حقہ پینے لگیں۔ میں ایک پان پر کتھہ چونا لگا کے ڈلیوں کا چورا ڈیا میں پڑا ہوا

تھا۔ ایک چٹکی اس کی اور لالہ پٹکی کے دانے پان دان کے ڈھکنوں پر کچل کے گلوری بنا کے بڑی بی کو دینے لگی۔

بڑی بی: ہائے بیٹا! دانت کہاں سے لاؤں جو پان کھاؤں۔

میں: آپ کھائیے تو میں نے آپ ہی کے لائق پان بنایا ہے۔

بڑی بی سمجھ گئیں۔ پان لے کے کھایا، بہت ہی خوش ہوئیں۔ ”ہائے ہمارے شہر کی تمیز داری!“ اتنا کہہ کے دعائیں دیتی ہوئیں رخصت ہوئیں۔ چلتے چلتے کہہ گئیں۔ ”ذرا دن سے آ جانا۔ گھڑی بھر دن رہے گرہ لگائی جائے گی۔“

میں: اگرچہ بحرے کا یہ دستور نہیں ہے مگر خیر بیگم صاحب نے یاد کیا

ہے تو میں سویرے سے حاضر ہو کر مبارک باد گاؤں گی۔

واقعی وطن کی قدر باہر جا کے ہوتی ہے۔ کانپور میں سینکڑوں جگہ بحرے ہوئے مگر کہیں جانے کا ایسا اشتیاق نہیں ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ جلدی سے شام ہو جائے اور میں روانہ ہوں۔ گرمیوں کا دن پہاڑ ہوتا ہے، خدا خدا کر کے اتنا دن کٹا۔ پانچ بجتے بجتے لڑکا آ موجود ہوا۔ میں پہلے ہی سے بنی ٹھنی بیٹھی تھی۔ سازندوں کو بلوار کھا تھا۔ لڑکے نے ان کے مکان کا پتا بتا دیا، میں سوار ہو کے روانہ ہو گئی۔

بیگم کا مکان شہر سے کوئی گھنٹے بھر کا راستہ تھا۔ چھ بجے میں وہاں پہنچی۔ نہر کے کنارے ایک باغ تھا جس کے چاروں طرف مینڈ پر ناگ پھنی اور دوسرے خاردار درخت اس طرح برابر بٹھائے گئے تھے جس سے ایک دیواری بن گئی تھی۔ باغ کی قطع بالکل انگریزی تھی۔ تاڑ، کھجور اور طرح طرح کے خوب صورت درخت قرینے سے لگائے گئے تھے۔ روشوں پر سرخی کٹی ہوئی تھی۔ چاروں طرف سبزہ تھا۔ جا بجا کھنگروں کی پہاڑیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ ان پر انواع و اقسام کے پہاڑی درخت پتھروں کے اندر سے اگے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ پہاڑیوں کے ارد گرد دوب جھائی گئی تھی۔ باغ میں ہر چار طرف کچے برہے ہوئے تھے ان میں صاف موتی سا پانی بہہ رہا تھا۔ مالی نلوں اور فواروں کے ذریعے سے پانی دے رہے تھے۔ پتیوں سے پانی فک رہا تھا۔ دن بھر کی دھوپ کھائے ہوئے پھولوں میں جواب پانی پہنچا تھا، کیسے تر و تازہ اور شاداب تھے۔

سالگرہ کی رسم کوٹھی میں ادا ہوئی تھی۔ عورتوں کے گانے کی آواز آئی۔ باہر میں نے مبارک باد گائی۔ پھر آپ ہی آپ شام کلیان کی ایک چیز شروع کر دی۔ کوئی سننے والا نہ تھا، آپ ہی آپ

گایا کی پھر چپ ہو رہی بیگم صاحب نے ایک اشرفی اور پانچ روپے انعام کے بھیجے۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی چاند نکل آیا چاندنی پھیل گئی۔ تالاب کے پانی میں ماہتاب کا عکس موجوں سے مل کر عجب کیفیت دکھا رہا تھا۔

باغ کے ایک کنارے پر بہت عالی شان کوٹھی تھی۔ وسط باغ میں ایک پختہ تالاب بنا ہوا تھا۔ اس کے گرد ولایتی پھولوں کے ٹاندے نہایت خوب صورتی سے سجے ہوئے تھے اسی تالاب سے ملا ہوا ایک اونچا چوڑا تھا۔ اس کے درمیان ایک مختصر سا ہوا دار چوبی بنگلہ تھا۔ اس کے ستونوں پر رنگ آمیزی کی ہوئی تھی۔ اس تالاب میں پانی نہر سے آ کے گرتا تھا۔ پانی کے گرنے کی آواز سے دل میں ٹھنڈک پہنچتی تھی۔ واقعی عجیب عالم تھا۔ شام کا سہانا وقت ستھری ہوا رنگ رنگ کے پھولوں کی مہک۔ ایسی فضا میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ چوڑے پرسفید چاندنی کافر ش تھا مسند تکیہ لگا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ہم لوگ بٹھائے گئے۔ کوٹھی سے لے کر اس چوڑے تک گلاب کی بیلوں سے ایک چھتا سا بنایا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اسی راہ سے بیگم صاحب تشریف لاتی ہیں۔ سامنے چلمنیں پڑی ہوئیں تھیں۔ چوڑے پر دو سبز مردنگیں روشن ہو گئیں۔ مجھے گانے کا حکم ہوا۔ میں نے کد ارے کی ایک چیز شروع کر دی۔ بڑی دیر تک گایا کی۔ اتنے میں ایک مہری ہاتھوں میں دو سبز کنول لیے ہوئے باہر نکلی۔ مسند کے سامنے رکھ دیئے۔ سازندوں سے کہا تم لوگ وہ سامنے شاگرد پیشہ میں چلے جاؤ وہیں کھانا بھیج دیا جائے گا۔ اب یہاں زنا نہ ہوگا۔ جب وہ لوگ اٹھ گئے بیگم صاحب برآمد ہوئیں میں تعظیم کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ انہوں نے مجھ کو قریب بلایا خود مسند پر بیٹھ گئیں۔ گانے کے لیے حکم کی منتظر تھی اور بیگم کی صورت غور سے دیکھ رہی تھی۔

حیرانی نگاہ تماشا کرے کوئی

صورت وہ رو برو ہے کہ دیکھا کرنے کوئی

پہلے تو وہ باغ اور وہاں کی فضا دیکھ کے مجھے پرستان کا شبہ ہوا تھا مگر اب یقین ہو گیا۔ پری میرے سامنے گاؤں کے سے لگی بیٹھی ہے۔ مانگ نکلی ہوئی ہے۔ چوٹی کمر تک پڑی ہوئی سرخ و سفید رنگت اونچا ماتھا کھنچی ہوئی بھویں بڑی بڑی آنکھیں گال جیسے گلاب کی پتیاں کچھوئی ناک چھوٹا سادہانا پتلے پتلے نازک ہونٹ۔ نقشے بھر میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے بہتر میرے خیال میں کوئی چیز آ سکتی ہو۔ اس پر اعضا کا تناسب اور سینے کا ابھرا پن کس قدر خوش نما تھا۔ سینکڑوں عورتیں



میری نظر سے گزر گئیں مگر میں نے اس بلا کی صورت کبھی نہ دیکھی تھی۔ خورشید سے بہت چھچک ملتی تھی۔ مگر کہاں خورشید کہاں وہ! خورشید کی صورت میں پھر ڈومنی پنا تھا۔ اس میں یہ امیرانہ رعب، یہ تمکنت، یہ بھاری بھر کم پن کہاں! دوسرے خورشیدان کے سامنے کسی قدر بھدی معلوم ہوتی تھی۔ ان کا کامنی سا نازک نازک چہرہ یا بدن اس نے کہاں پایا۔ دوسرے اس کی صورت پر آٹھ پہر ادا سی برستی تھی جب دیکھو بروگن بنی تھی۔ بیگم صاحب بہت خوش مزاج معلوم ہوتی ہیں۔ بات کرتی ہیں گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ہر بات پر خود بہ خود ہنسے دیتی ہیں مگر کسی کو مجال کلام نہیں۔ واقعی سادگی میں تکلف اور تمکنت کے ساتھ شوخی انہی میں دیکھی۔ دولت مندوں کی خوشامد سب کرتے ہیں مگر عورت ذات ہو کے کہتی ہوں کہ ایسوں کی خوشامد بھی اگر بے غرض کی جائے تو کوئی عیب نہیں۔ لباس اور زیور بھی اسی صورت کے لائق تھا۔ مہین بستی دوپٹا کندھوں سے ڈھلکا ہوا، کیچلی کاشلو کا پھنسا پھنسا، سرخ گرٹ کا پاشجامہ، کانوں میں صرف یا قوت کے آویزے، ناک میں ہیرے کی کیل، گلے میں سونے کا سادہ طوق، ہاتھوں میں موتیوں کی سرنیں، بازوؤں پر نورتن، پاؤں میں سونے کی بیڑیاں۔ چہرے کی خوب صورتی، لباس کی سادگی اور زیور کی مناسبت، یہ سب چیزیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں اور میں نقش حیرت بنی بیٹھی تھی۔ بغور صورت دیکھ رہی تھی۔ میں اور میری صورت تو جیسی کچھ ہے، وہ اس وقت آپ کے سامنے ہے، مگر یقین ہی کیجیے گا، ان کی توجہ بھی کسی اور طرف نہ تھی، مجھی کو دیکھ رہی تھیں۔ دونوں طرف سے نگاہیں لڑی ہوئی تھیں۔ میرے دل میں بار بار ایک خیال آتا تھا مگر اس کے اظہار کا موقع نہ تھا۔ کہوں تو کیوں کر کہوں۔ ایک مہری پس پشت کھڑی پنکھا جھل رہی ہے، دو سامنے کھڑی ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں چاندی کی ڈبیا، دوسری کے پاس خاص دان۔ بڑی دیر تک نہ بیگم صاحب نے مجھ سے بات چیت کی اور نہ میں کچھ بول سکی۔ آخر انہوں نے سلسلہ کلام اس طرح شروع کیا۔

بیگم: تمہارا نام کیا ہے؟

میں: (ہاتھ باندھ کے) امراد۔

بیگم: ”خاص لکھنؤ میں مکان ہے۔“

(یہ سوال کچھ اس رخ سے کیا گیا تھا کہ مجھے جواب دینا مشکل ہوا، خصوصاً اس موقع پر اس لیے کہ اگر کہتی ہوں کہ لکھنؤ میں مکان ہے تو ایک مطلب جو میرے دل میں تھا فوت ہو جاتا ہے۔ فیض آباد بتاتی ہوں تو بے محل افشائے راز کا خیال ہے، آخر بہت سوچ سمجھ کے)

میں: جی ہاں پرورش تو لکھنؤ میں پائی ہے۔

جواب دینے کو تو دے دیا، مگر اس کے ساتھ ہی خیال ہوا کہ اب جو سوال کیا جائے گا تو پھر وہی وقت پیش آئے گی۔ میرا خیال غلط نہ تھا اس لیے کہ فوراً بیگم صاحب نے پوچھا۔  
بیگم: تو کیا پیدائش لکھنؤ کی نہیں ہے؟

اب حیران ہوں کہ کیا جواب دوں۔ تھوڑی دیر سکوت کیا، جیسے کچھ سنا ہی نہ تھا۔ آخر اس بات کو ٹال کے۔

میں: حضور کا دولت خانہ لکھنؤ میں ہے؟

بیگم: کبھی لکھنؤ میں تھا اب تو کانپور ہی وطن ہو گیا۔

میں: میرا بھی یہی ارادہ ہے۔

بیگم: کیوں؟

میں: (اس سوال کا جواب دینا بھی دشوار تھا۔ کون قصہ بیان کرتا)

اب کیا عرض کروں، بیکار سمع خراشی ہوگی۔ حال ناگفتہ بہ ہے۔  
کچھ ایسے ہی واقعات پیش آئے کہ لکھنؤ جانے کو جی نہیں چاہتا۔  
چلو اچھا ہے تو ہمارے پاس بھی کبھی چلی آیا کرو۔

میں: آنا کیسا، میرا تو ابھی سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ اول تو آپ کی

قدر دانی، دوسرے یہ باغ، یہ فضا، ممکن ہے کہ کوئی ایک بار دیکھے  
اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس نہ ہو؟ خصوصاً مجھ جیسی خفقانی مزاج کی  
عورت کے لیے تو یہاں کی آب و ہوا اسیر کا خواص رکھتی ہے۔

بیگم: اے ہے! تمہیں یہ جنگلہ بہت پسند آیا۔ نہ آدمی نہ آدم ذات،  
بیہات خدا کی ذات، شہر سے کوسوں دور چار پیسوں کا سودا منگاؤ  
تو آدمی صبح کا گیا شام کو آتا ہے۔ چھائیں چھائیں شیطان کے  
کان بہرے، کوئی بیمار ہو تو جب حکیم صاحب شہر سے آئیں،  
یہاں دشمنوں کا خاتمہ ہو جائے۔

میں: حضور اپنی اپنی طبیعت! مجھے تو بہت ہی پسند ہے۔ میں تو جانتی

ہوں کہ اگر یہاں رہوں تو مجھے کسی چیز کی ضرورت ہی نہ ہو۔

دوسرے ایسے مقام پر بیمار ہونا کیا ضرور ہے۔

بیگم:

جب میں پہلے پہل آئی تھی تو میرا بھی یہی خیال تھا۔ کچھ دنوں یہاں رہ کے معلوم ہوا کہ شہر کے رہنے والے ایسے مقام پر نہیں رہ سکتے۔ شہر میں ہزار طرح کا آرام ہے۔ اور سب باتوں کو جانے دو جب سے نواب کلکتے گئے ہیں راتوں کو ڈر کے مارے نیند نہیں آتی۔ یوں تو خدا کے دیئے سپاہی، پاسی، خدمت گار اس وقت بھی دس مرد نوکر ہیں۔ عورتوں کی کنتی نہیں۔ مگر پھر بھی ڈر لگتا ہے۔ میں تو دو چار دن اور راہ دیکھتی ہوں اگر نواب جی جم آئے تو میں شہر میں کوئی مکان لے کے جا رہوں گی۔

میں:

قصور معاف ہو، آپ کا مزاج وہی ہے۔ ایسے ایسے دسواں دل میں نہ لایا کیجیے۔ شہر میں جائے گا تو قدر و عافیت کھلے گی۔ وہ گرمی ہے کہ آدمی پکے جاتے ہیں۔ دوسرے بیماریاں خدا پناہ میں رکھے!

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں کھلائی بچے کو لے کر آئی۔ تین برس کا لڑکا تھا، ماشاء اللہ گورا گورا، خوبصورت۔ ایسی پیاری پیاری باتیں کرنا تھا جیسے مینا۔ بیگم نے کھلائی سے لے کے گود میں بٹھا لیا۔ تھوڑی دیر کھلا کد کے پھر کھلائی کو دینے لگیں کہ میں نے ہاتھ بڑھا کے لے لیا۔ بڑی دیر تک لیے رہی اور پیار کیا کی پھر کھلائی کو دے دیا۔

میں:

یوں تو شاید نہ بھی آتی، مگر میاں کو دیکھنے تو ضرور ہی آؤں گی۔

بیگم:

(مسکرا کے) اچھا کسی طرح ہو، آنا ضرور۔

میں:

ضرور ضرور حاضر ہوں گی۔ یہ آپ بار بار کیوں فرماتی ہیں۔ میں

تو اس قدر حاضر ہوں گی کہ حضور کو دو بھر ہو جاؤں گی۔

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بیگم نے میرے گانے کی بہت تعریف کی۔ اسی

اثنا میں خاصہ والی نے آ کے کہا کہ خاصہ تیار ہے۔ بیگم نے کہا چلو کھانا کھا لو۔

میں:

بہت خوب!

بیگم مسند سے اٹھ کھڑی ہوئیں، میں بھی ساتھ ہی اٹھی۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مہر یوں کو اشارہ کیا

تم یہیں ٹھہرو۔ ہم کھانا کھا کے یہیں بیٹھیں گے۔

میں: واقعی اس وقت کا سماں تو ایسا ہے کہ جانے کو جی نہیں چاہتا۔

بیگم: تو کیا کھانا یہیں منگو لیا جائے؟

میں: جی نہیں! اچھا، کھانا کھا کے چلے آئیں گے۔

بیگم: (ایک مہری سے) ان کے ساتھ کے آدمیوں کو کھانا دلوا دیا گیا؟

مہری: (ہاتھ باندھ کے) حضور! دلوا دیا گیا۔

بیگم: اچھا انہیں رخصت کرو۔ ہم نے دوسرا مجرا معاف کیا۔ امر او

جان کھانا کھا کے جاویں گی۔

اس کے بعد بیگم اور ہم دونوں کوٹھی کی طرف چلے۔ ایک مہری آگے آگے فانوس لیے جاتی

تھی۔ چپکے سے میرے کان میں کہا ”مجھ کو تم سے بہت باتیں کرنا ہیں، مگر آج اس کا موقع نہیں۔ کل

تو مجھے فرصت نہ ہوگی، پرسوں تم صبح آنا اور کھانا یہیں کھانا“

میں: مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے۔

بیگم: اچھا تو آج کچھ نہ کہو۔ چلو کھانا کھالیں، اس کے بعد تمہارا گانا

سنیں گے۔

میں: پھر سازندوں کو تو حضور رخصت کر دیا۔

بیگم: ہم کو مردوں کے ساتھ گانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میری ایک

خواص خوب طلبہ بجاتی ہے۔ اس پر گانا۔

میں: بہت خوب!

اب ہم کوٹھی کے زینے کے پاس پہنچ گئے تھے۔ بہت وسیع کوٹھی تھی اور اس طرح سلیقے سے بنی

ہوئی تھی کہ شاہی کوٹھیوں کے دیکھنے کے بعد اگر کوئی کوٹھی دیکھی تو یہی دیکھی۔ پہلے برآمدہ ملا، اس

کے بعد کئی کمروں سے ہو کے گزرے۔ ہر ایک نئے طرز سے سجا ہوا تھا۔ ہر کمرے کا فرش فروش

اور شیشہ آلات ایک نئے رنگ اور نئے طرز کا تھا۔ آخر ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں دسترخوان

چننا ہوا تھا۔ دسترخوان پر دو عورتیں اور منتظر تھیں۔ ان میں سے ایک چٹھی نولیس تھی، ایک مصاحب۔

ان دونوں کا لباس بھی بہت ہی زرق برق تھا۔

دسترخوان پر کئی قسم کے پلاؤ، بریانی، مزعفر، تنجن، سفیدہ، شیر برنج، باقر خانیان، کئی طرح کے



سالن، کباب، اچار، مربے، مٹھائیاں، وہی بالائی غرض کہ ہمہ قسم کی نعمت موجود تھی۔ لکھنؤ سے نکلنے کے بعد آج کھانے کا مزہ آیا۔ بیگم ہر طرح کی چیزیں میرے سامنے رکھتی جاتی تھیں۔ میں اگرچہ کسی قدر تکلف سے کھانا کھاتی تھی مگر ان کے اصرار نے ضرورت سے زیادہ کھلایا۔

بیس دانی اور تسلہ آیا ہاتھ منہ دھو کے سب نے پان کھائے۔ پھر اسی چبوترے پر جلسہ جما اس جلسے میں صرف بیگم صاحب ہی نہ تھیں۔ چٹھی نویس، مصاحبین، مغلانیاں، پیش خدمتیں، مہرباں، ماماں سب ملا کے کوئی دس بارہ عورتیں تھیں۔

بیگم صاحب نے حکم دیا کہ طبلے کی جوڑی اور ستار اٹھالاؤ۔ ایک مصاحب، جو طبلہ بجانے میں مشاق تھی، طبلہ بجانے لگی، خود بیگم صاحب ستار چھیڑنے لگیں، مجھے گانے کا حکم دیا۔

کھاتے کھاتے گیارہ بج چکے تھے۔ جب ہم گانے کو بیٹھے ہیں ٹھیک بارہ بجے کا وقت تھا۔ اس وقت وہ باغ، جس میں بہت سا روپیہ صرف کر کے جنگل اور پہاڑ کی گھاٹیوں کے نمونے بنائے گئے تھے، عجب وحشت ناک سماں دکھا رہا تھا۔ ایک طرف چاند اس عالی شان کوٹھی کے ایک گوشے سے تھوڑی دور پر گنجان درختوں کی شاخوں سے نظر آتا تھا۔ مگر اب ڈوبنے ہی کو تھا۔ تاریکی روشنی پر چھائی جاتی تھی جس سے ہر چیز بھیاں تک معلوم ہونے لگی۔ درخت جتنے اونچے تھے اس سے کہیں بڑے نظر آتے تھے۔ ہوا سن سن چل رہی تھی۔ سرو کے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی کا عالم تھا۔ مگر تالاب میں پانی گرنے کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی پرندہ اپنے آشیانے میں چونک کر ایک ہانک بول دیتا تھا یا شکاری جانوروں کے ہول سے جو چڑیاں اڑتی تھیں اس سے پتے کھڑک جاتے تھے یا کبھی کوئی مچھلی تالاب میں اچھل پڑتی تھی۔ مینڈک اپنا بے ٹکاراگ گارہے تھے۔ جھینگر آس دے رہے تھے۔ خوائے اس چبوترے کے جہاں دس بارہ جوان جوان عورتیں رنگ رنگ کے لباس پہنے اور طرح طرح کے زیور آراستہ جلسہ جمائے بیٹھی تھیں، اور کوئی آس پاس نہ تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے کنول بجھ گئے تھے۔ صرف دو مردگوں کی روشنی تھی ان کے بھی شیشے سبز۔ تاروں کا عکس تالاب کے پانی میں ہلکورے لے رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ طلسمات کا عالم تھا۔ وقت اور مقام کی مناسبت سے میں نے سوہنی کی ایک چیز شروع کر دی۔ اس راگنی کے بھیاں تک سروں نے دلوں پر اپنا اثر کیا تھا۔ سب مبہوت بیٹھے تھے۔

مارے خوف کے باغ کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ خصوصاً گنجان درختوں کے نیچے اندھیرا گھپ تھا۔ سب ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔ گویا وہ جلسہ امن کی جگہ تھی اور جدھر نگاہ

اٹھا کے دیکھو ایک ہو کا عالم تھا۔ اوروں کا کیا ذکر خود میرا کلیجہ دھڑک رہا تھا۔ دل ہی دل میں کہتی تھی بیگم نے سچ کہا تھا، بے شک یہ جگہ رہنے کے لائق نہیں ہے۔ اس اثنا میں گیدڑ کے بولنے کی آواز آئی اس نے اور بھی دلوں کو دہلا دیا اس کے بعد کتے بھونکنے لگے۔ اب تو مارے دہشت کے یہ حال تھا کہ کسی کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ اتنے میں بیگم صاحب نے گاؤں کے سے ذرا اونچی ہو کے اپنے سامنے کچھ دیکھا اور زور سے ایک چیخ مار کے مسند پر گر پڑیں اور سب عورتیں بھی اسی طرف دیکھنے لگیں، میں بھی مڑ کے دیکھنے لگی۔

بیگم صاحب کو میں سمجھ چکی تھی کہ وہی ہیں، مگر اب جو دیکھتی ہوں تو ان کے وہم کی حقیقت نظر آنے لگی۔ سامنے سے دس پندرہ آدمی منہ پر ڈھانٹے باندھے، ننگی تلواریں ہاتھ میں دوڑتے چلے آتے ہیں۔ عورتوں کے چلانے سے بیگم کے نوکر چاکر خدمت گار پاسی سب اسی طرف کو چلے۔ کوئی نہتا، کسی کے ہاتھ میں لاٹھی۔ مگر ڈاکو زیادہ تھے اور یہاں آدمی کم تھے۔ کئی تو راستے ہی سے فرار ہو گئے، چار پانچ آدمی چبوترے تک پہنچ ہی گئے۔ انہوں نے عورتوں کو بیچ میں کر لیا اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو کے کھڑے ہو گئے۔ عورتوں میں سے کسی کو ہوش نہ تھا، سب غش کی حالت میں بے دم پڑی تھیں۔ ایک میں خدا جانے کیا پتھر دل تھا، کہ بیٹھی رہی۔ مارے ہول کے دم نکلا جاتا تھا۔ یا اللہ! دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

بیگم کے آدمیوں میں سے جن کے پاس حربے تھے۔ وہ آگے بڑھنے ہی کو تھے کہ سرفراز نامی ایک سپاہی نے روکا۔

سرفراز: (اپنے ساتھیوں سے) ٹھہرو! ابھی جلدی نہ کرو۔ پہلے ہمیں ان لوگوں کا عندیہ معلوم کر لینے دو۔ (ڈاکوڑوں سے) تم لوگ کس ارادے سے آئے ہو؟

ایک ڈاکو: جس ارادے سے آئے ہیں تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔

سرفراز: وہی میں پوچھتا ہوں، جان کے خواہاں ہو یا مال کے؟

دوسرا ڈاکو: ہمیں جان سے کوئی غرض نہیں۔ کوئی باپ مارے کا بیر ہے؟ ہاں

جس ارادے سے آئے ہیں اس میں تم مزاحم ہو گئے تو دیکھا جائے گا۔

سرفراز: (کسی قدر سخت ہو کے) تو کیا بہو بیٹیوں کی آبرو لو گے؟ اگر یہ

مقصد ہو..... (سرفراز پوری بات بھی کرنے نہ پایا تھا کہ کسی نے  
ڈاکوڑوں کی طرف سے کہا)

کوئی ڈاکو: نا صاحب! کسی کی بہو بیٹیوں سے کیا واسطہ۔ کیا ہمارے بہو  
بیٹیاں نہیں ہیں؟ عورتوں کے کوئی ہاتھ لگا سکتا ہے؟

سرفراز: (خوش ہو کے) تو پھر یہی میں پوچھتا ہوں۔ اچھا تو بھائیو ہم  
ابھی تمہیں کمروں کی کنجیاں منگائے دیتے ہیں اور جو عورتیں  
وہاں ہیں ان کو یہاں بلوائے لیتے ہیں۔ گھر کی مالک بیگم یہیں  
ہیں۔ تم شوق سے کوٹھی میں جاؤ جو جی چاہے اٹھالے جاؤ۔ رہا  
عورتوں کا زیور وہ بھی ہم اتروائے دیتے ہیں۔ ہمارا مالک کچھ  
اس سے غریب نہ ہو جائے گا۔ خدا کے حکم سے لاکھوں روپیہ  
بینک گھر میں جمع ہے۔ علاقے سے جو آتا ہے اس کا ذکر نہیں۔

ڈاکو: اس سے بہتر کیا ہے۔ مگر اس میں دغا نہ ہو۔

سرفراز: سپاہی کے پوتے دغا نہیں کرتے، خاطر جمع رکھو۔

اتنا کہنا تھا کہ میری اس کی نگاہیں چار ہوئیں۔ میں نے پہچان تو لیا، بولنے کا قصد کیا، مگر دل  
میں ایسی دہشت سمائی ہوئی تھی کہ منہ سے آواز نہ نکلتی تھی کہ اتنے میں خود اس نے آگے بڑھ کے کہا  
”بھابی! تم یہاں کہاں؟“

میں: جب سے تمہارے بھائی قید ہو گئے یہیں ہوں۔

فضل علی: یہاں کس کے پاس؟

میں: رہتی تو شہر میں ہوں لیکن یہاں میری ایک بہن بیگم صاحب کے

پاس نوکر ہیں ان سے ملنے آئی تھی۔

فضل علی: تمہاری بہن کہاں ہیں؟

میں: یہیں ہیں۔ جب سے تم لوگوں کے آنے کا ہنگامہ ہوا بے چاری

غش میں پڑی ہیں۔ میری طرح تو ہیں نہیں، بیچاری پردہ نشیں

ہیں؟

فضل علی: پردہ نشیں ہیں؟

میں: جوانی میں رائڈ ہوئیں، جب سے امیر رئیسوں کی نوکریاں کرتی پھرتی ہیں۔

فضل علی: (اپنے ساتھیوں سے) یہاں سے ایک پیسے کی چیز لینا میرے نزدیک تو حرام ہے اور نہ میں اس معاملے میں تمہارے ساتھ ہوں۔

ایک ڈاکو: یہ کیا پھر آئے کیوں تھے؟  
فضل علی: جس ارادے سے آئے، تمہیں معلوم ہے، مگر کسی کا خیال بھی ہے۔ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ فیضو بھائی کی آشنا اور اس کی بہن کا اسباب لوٹوں، یا جس سرکار سے ان لوگوں کا توکل ہو وہاں دست درازی کروں۔ اگر وہ قید میں سنے گا تو کیا کہے گا!

اس بات پر ڈاکوؤں کے آپس میں بہت جھگڑا ہونے لگا، مگر سب فضل علی کا دباؤ مانتے تھے، کوئی دم نہ مار سکتا تھا۔ پھر بھی خالی ہاتھ پھر جانا کچھ ایسی سہل بات نہ تھی۔ سب ڈاکو غل مچاتے تھے، ”فاقوں مرتے ہیں، کریں تو کیا کریں۔ ایک موقع ملا بھی تو اسے خان صاحب چھوڑے دیتے ہیں۔ آخر پیٹ کہاں سے پالیں۔“

جب فضل علی اپنے گروہ سے جل کے الگ کھڑے ہوئے تو ان کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور شخص سیاہ فام سایہ کہتا ہوا نکلا۔

وہ شخص: کھان صاحب، میں بھی ترے ساتھ ہوں۔

غور سے جو دیکھتی ہوں، معلوم ہوا کہ فیض علی کا سائیکس ہے۔ میں نے اسے بلایا۔ علیحدہ لے جا کے باتیں کیں۔ وہ اشرفی اور روپے جو بیگم صاحب نے انعام دئے تھے، چپکے سے اسے دے دیئے۔

فضل علی: (سرفراز خان سے) بھائی میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم جانو اور یہ لوگ۔

سرفراز: میں ان لوگوں کو بھی راضی کئے دیتا ہوں۔ مگر یہاں سے چلو۔ عورتیں پریشان ہو رہی ہیں۔ ذرا ان کو ہوش میں آنے دو۔ ہم تم لوگوں کو خوش کریں گے۔ ڈاکو وہاں سے چلے گئے۔ بیگم صاحب



ابھی تک بے ہوش پڑی تھیں۔ دانت بیٹھ گئے تھے۔ میں تالاب سے ہاتھ میں پانی لائی ان کے منہ پر چھینٹے دیے۔ بڑی مشکل سے ہوش میں آئیں۔ میں نے کہا ”سنجھل کے بیٹھے خدا کے صدقے سے وہ آفت ٹل گئی۔ خاطر جمع رکھئے۔“ اور عورتوں کو بھی پانی چھڑک کراٹھایا۔ سب اٹھ کے بیٹھیں۔ جب اطمینان ہو گیا تو میں نے کل قصہ بیان کیا۔ بیگم صاحب بہت خوش ہوئیں۔ سرفراز خان کو بلا بھیجا۔

سرفراز: سرکار کچھ دے دیجئے بغیر اس کے کام نہ چلے گا۔ اس وقت نہ امر او جان یہاں ہوتیں نہ یہ آفت ٹلتی۔  
بیگم: کسی نہ کسی وقت کی محبت کام آ ہی جاتی ہے۔

میں نے اس بات کا جواب نہ دیا اس لیے کہ میں سمجھ گئی کہ اس وقت گھبراہٹ میں یہ راز کی بات ان کے منہ سے نکل گئی ہے۔ اس موقع پر ایسی باتوں کا اظہار ان کی شان کے خلاف ہے۔ جی نہیں۔ میں نے کیا کیا۔ یہ بھی اتفاق تھا۔

مختصر یہ کہ بیگم نے صندوق منگایا۔ پانچ سو نقد اور پانچ پانچ سو کا سونے چاندی کا زیور دے کے انہیں ٹالا۔ سب کی جان میں جان آئی۔ بیگم کا اس وقت کا کہنا مجھے آج تک یاد ہے۔

بیگم: کیوں امر او جان! باغ میں رہنے کا مزاد یکھا؟  
میں: حضور سچ کہتی تھیں۔

اب صبح کے تین بج گئے تھے سب لوگ اٹھ اٹھ کے کوٹھی میں گئے۔ ان لوگوں کے ساتھ میں بھی اٹھی۔ کوٹھی کے برآمدے میں ایک پلنگ میرے لیے بچھوا دیا گیا۔ نیند کسے آتی۔ رات بھر جاگ رہی۔ صبح ہوتے سب سو گئے۔ میری آنکھ بھی لگ گئی۔ ابھی نیند بھر کے سونے نہ پائی تھی کہ میرے خدمت گار سواری لے کے آ گئے۔ مجھے جگایا میں آنکھیں ملتی ہوئی باہر گئی۔

خدمت گار: آپ تو خوب یہاں آئیں رات بھر ہم لوگ راہ دیکھا کیے۔  
میں: کیوں کر آتی۔ سواری کو تو رخصت کر دیا تھا۔

خدمت گار: اچھا تو اب چلئے۔ لکھنؤ سے لوگ آپ کے پاس آئے ہیں۔

میں سمجھ گئی۔ ہوں نہ ہوں بوا حسینی اور گوہر مرزا ہوں گے۔ آخر بتاؤ گا لہانا!

میں: اچھا چلتی ہوں سواری لائے ہو؟

”خدمت گار: حاضر ہے۔“

جب میں نے جانے کا قصد کیا دو ایک عورتیں اور جاگ چکی تھیں۔ مجھ کو روکا کہ بیگم صاحب سے مل کے جائیے گا۔ میں نے کہا اس وقت کام ہے بیگم صاحب خدا جانے کب سو کے اٹھیں گی۔ ایسا ہی ہے تو پھر آؤں گی۔

عورتیں: بھلا اب کیا آؤں گی۔

گھر پر جو آ کے دیکھتی ہوں بوا حسینی اور میاں گوہر بیٹھے ہوئے ہیں۔ بوا حسینی میرے گلے سے لپٹ گئیں رونے لگیں میں بھی رونے لگی۔

بوا حسینی: اللہ بیٹی! کیا سخت دل کر لیا۔ تمہیں کسی کی محبت ہی نہیں۔

میں بجائے خود شرمندہ تھی جواب کیا دیتی تھوٹ موٹ رونے لگی۔

معمولی گفتگو کے بعد بوا حسینی نے اسی دن لکھنؤ چلنے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے لاکھ اصرار کیا کہ ٹھہر جاؤ انہوں نے نہ مانا۔ زیادہ عجلت کی وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب بیمار تھے بوا حسینی کو دم بھر کہیں کا ٹھہرنا شاق تھا۔ ایسی ہی میری محبت تھی جو چلی آئی تھیں وہ دن کانپور سے اسباب وغیرہ کے باندھنے اور مکان کے کرائے اور نوکروں چاکروں کے حساب کرنے میں تمام ہوا۔ پوری شکرم کرائے پر لی تھی۔ ضروری اسباب اس پر لا دلیا اور فضول سامان نوکروں کو دے دیا۔ دوسرے دن لکھنؤ پہنچ گئی۔ پھر وہی آب و دانہ ہے وہی مکان وہی کمرہ وہی آدمی۔

دشت جنوں کی سیر میں بہلا ہوا تھا دل

زنداں میں لائے پھر مجھے احباب گھر کے

۳

دیکھئے پہنچے کہاں تک سوز دل کا اثر

صر صر وحشت کا یہ شعلہ ہے بھڑکایا ہوا

نواب ملکہ کشور کی سرکار میں سوز خوانی کا سلسلہ انتزاع سلطنت کے زمانے تک رہا۔ اسی

۱۶۳ — امراد جان ادا

انشاء میں شہزادے مرزا اسکندر حشمت عرف جرنیل صاحب کے مجرایوں میں میرا بھی اسم ہو گیا تھا۔  
جناب عالیہ اور جرنیل صاحب کلکتے چلے گئے وہ تعلق منقطع ہو گیا۔

جس زمانے میں باغی فوج نے مرزا برجیس قدر کو مسند ریاست پر بٹھایا، میں بہ لحاظ قد امت اور اس وجہ سے بھی کہ میرا نام شاہی محلات میں اکثر کی زبان پر تھا، مبارک باد دینے کے لیے طلب ہوئی۔ شہر میں ایک اندھیر تھا۔ آج اس کا گھر لٹا، کل وہ گرفتار ہوا، پرسوں اس کے گولی لگی۔ چاروں طرف قیامت کا سماں نظر آتا تھا۔ سید قطب الدین نامی ایک صاحب افسران فوج میں تھے ان کا تعین در دولت پر تھا۔ میرے حال پر بہت عنایت کرتے تھے اس لیے اکثر وہیں رہنا پڑتا تھا۔ بحرے کے لیے بھی وقت بے وقت طلبی ہو جاتی تھی۔ اب چند روزہ حکومت کے زمانے میں برجیس قدر کے گیارہویں سال کی سالگرہ کا جلسہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اس جلسے میں کشمیریوں نے یہ غزل گائی تھی۔

غیرت مہتاب ہے برجیس قدر

گو ہر نایاب ہے برجیس قدر

میں نے ایک غزل اس موقع کے لیے تصنیف کی تھی اس کا مطلع ہی ہے۔

دل ہزاروں کے تری بھولی ادائیں لیں گی

حسرتیں چاہنے والوں کی بلائیں لیں گی

امراد جان! تم نے مطلع تو قیامت ہی کا کہا ہے۔ اور کوئی شعر یاد ہو تو پڑھو۔

رسوا:

امراد: گیارہ شعر کہے تھے مگر آپ کے سر کی قسم! سوا اس مطلع کے اور

کوئی شعر یاد نہیں۔ وہ زمانہ ایسی آفت کا تھا، نگوڑی دن رات

جان دھڑ کے میں رہتی تھی۔ غزل ایک پرچے پر لکھ لی تھی۔ جس

دن تک بیگم صاحب قیصر باغ سے نکلی ہیں وہ پرچہ میرے پان

دان میں تھا۔ پھر جب وہاں سے نکلنا ہوا، ہول جوں میں پان

دان کیسا، جوتیاں اور دوپٹے تک چھوٹ گئے۔

بھلا کچھ یاد ہے؟ بیگم صاحب کس دن قیصر باغ سے نکلی تھیں؟

رسوا:

دن تو یاد نہیں ہزاری روزے کے دوسرے یا تیسرے دن۔

امراؤ:

ہاں تمہیں خوب یاد رہا رجب کی انیسویں تاریخ تھی۔ بھلا فصل

رسوا:

کون سی تھی؟

آخر جاڑے تھے، نوروز کے چار پانچ دن باقی رہے ہوں گے۔

امراؤ:

بالکل درست۔ مارچ کی سولہویں تاریخ تھی۔ اچھا تو تم بیگم

رسوا:

صاحب کے ساتھ قیصر باغ سے نکلیں؟

جی ہاں، بوٹڈی تک میں ہمراہ گئی۔ راستے میں نمک حرام اور

امراؤ:

بزدل افسران فوج کے غمزے اور بیگم صاحب کی خوشامد عمر بھر نہ

بھولے گی۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ ”لو صاحب ان کے راج

میں ہم پیدل چلیں۔“ دوسرے صاحب فرماتے ہیں۔ ”بھلا

کھانے کا تو انتظام درست ہوتا۔“ تیسرے صاحب! ایم کو

پیٹ رہے ہیں۔ چوتھے اپنی جان کو رو رہے ہیں کہ حقہ وقت پر

نہیں ملا۔ جب بہرائچ سے انگریزی فوج نے بوٹڈی پر دھاوا کیا

ہے، اس میں سید قطب الدین مارے گئے۔ بیگم صاحب نیپال

کی طرف روانہ ہوئیں، میں اپنی جان بچا کے فیض آباد چلی

آئی۔

سنا ہے بوٹڈی میں چار دن کے لیے خوب چہل پہل ہو گئی تھی۔

رسوا:

آپ نے تو سنا ہے، میں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لکھنؤ

امراؤ:

کے بھاگے ہوئے سب وہیں جمع ہو گئے تھے۔ بوٹڈی کا بازار

لکھنؤ کا چوک معلوم ہوتا تھا۔

اچھا اس قصے سے مجھ کو زیادہ دلچسپی نہیں۔ یہ کہیے کہ وہ مال جو

رسوا:

آپ نے میاں فیضو سے لیا تھا اس کا حشر کیا ہوا؟

(ایک سرد آہ بھرنے کے) اسے ہے یہ نہ پوچھیے۔

امراؤ:

غدر میں سب لٹ گیا؟

رسوا:

غدر میں لٹ جاتا تو اتنا فسوس نہ ہوتا۔

امراؤ:



رسوا: پھر کیا ہوا؟

امراؤ: سارا قصہ دہرائی پڑا۔ جس دن شب کو میں فیضو کے ساتھ بھاگنے والی تھی، میں نے کل زیور اور اشرفیاں ایک پٹاری میں بند کیں، اوپر سے خوب کپڑا لپیٹ دیا۔ خانم کے پچھواڑے ایک میر صاحب رہتے تھے، امام باڑے کے کوٹھے کے دیوار پر چڑھ جاؤ تو ان کے مکان کا سامنا ہو جاتا تھا۔ میں اکثر چارپائی لگا کے اس دیوار پر چڑھ جایا کرتی تھی اور میر صاحب کی بہن سے باتیں کیا کرتی تھیں۔ وہ زیور کی پٹاری میں نے ان کی بہن کے پاس پھینک دی اور ان کے ہاتھ جوڑ کے کہا کہ اس کو حفاظت سے رکھنا۔ انہوں نے فیض آباد سے آنے کے بعد وہ پٹاری اسی طرح گودڑ میں لپیٹی ہوئی میرے حوالے کر دی۔ غدر میں تمام دنیا کے گھر لٹے۔ اگر کہہ دیتیں کہ لٹ گئی تو میں ان کا کیا کر لیتی، مگر واہ ری بیوی! ایک جبہ تک نقصان نہیں ہوا۔ ایسے ہی لوگوں سے زمین و آسمان تھک رہا ہوا ہے۔ نہیں تو کب کی قیامت آ جاتی۔

رسوا: بھلا کتنے کا مال تھا؟

امراؤ: کوئی دس ہزار کا مال تھا۔

رسوا: اور اب کیا ہوا؟

امراؤ: کیا ہوا؟ جس راہ آیا تھا اسی راہ گیا۔

رسوا: مگر لوگ تو مشہور کرتے ہیں کہ تمہارا ایک جبہ بھی غدر میں نہیں لٹا، سب مال تمہارے پاس ہے۔

امراؤ: اگر مال ہوتا تو ان حالوں میں رہتی جیسی اب رہتی ہوں۔

رسوا: لوگ کہتے ہیں کہ تم نے اپنا بھگل نکالا ہے۔ اگر نہیں ہے تو خرچ

کہاں سے چلتا ہے۔ اب بھی کچھ برے حالوں نہیں رہتیں۔ دو آدمی نوکر ہیں۔ خوش خوراک خوش پوشاک بھی ہو۔

امراؤ: خدا رازق ہے۔ جو جس کا خرچ ہے وہ ضرور اس کو ملتا ہے۔ اس

مال کا تو ایک حصہ بھی نہیں رہا۔

اچھا تو پھر کیا ہوا؟

رسوا:

اب کیا بتاؤں، ایک مہربان.....

امراؤ:

میں سمجھ گیا۔ یہ گوہر مرزا کی حرکت ہوگی؟

رسوا:

میں اپنے منہ سے نہیں کہتی شاید آپ کا قیاس غلط ہو۔

امراؤ:

بے شک تمہارے عالی ظرف ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ دیکھیے وہ

رسوا:

چھین کر رہے ہیں اور تمہیں پوچھتے تک نہیں۔

مرزا صاحب! رنڈی سے رسم رہا رہا نہ رہا نہ رہا۔ اب وہ مجھے

امراؤ:

کیوں پوچھیں۔

مدت ہوئی کہ ترک ملاقات ہو گئی

اب کبھی تشریف بھی لاتے ہیں؟

رسوا:

وہ کا ہے کو تشریف لائیں گے۔ میں اکثر جایا کرتی ہوں۔ ان کی

امراؤ:

بیوی سے محبت ہو گئی ہے۔ ابھی چار دن ہوئے لڑکے کی دودھ

بڑھائی کی تھی تو بلا بھیجا تھا۔

جب بھی کچھ دے ہی آئی ہوگی؟

رسوا:

جی نہیں، میں کسی قابل ہوں جو کسی کو کچھ دوں گی۔

امراؤ:

تو وہ مال گوہر مرزا صاحب کے ہاتھ کیسے لگا؟

رسوا:

مرزا صاحب! مال کی کوئی حقیقت نہیں ہے ہاتھوں کا میل ہے

امراؤ:

فقط بات رہ جاتی ہے۔ اب بھی اپنے پیدا کرنے والے کے

قربان جاؤں! کبھی تنگی بھڑکی نہیں رہتی۔ آپ ایسے قدردانوں کو

خدا سلامت رکھے! مجھے کسی بات کی تکلیف نہیں ہے۔

اس میں کیا شک ہے۔ وہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں اب بھی سو

رسوا:

سے اچھی ہزار سے اچھی۔ واللہ! یہ تمہاری نیت کا ثمرہ ہے۔ خدا

نے زیارت سے بھی مشرف کیا۔

جی ہاں، مولانا نے سب مرادیں پوری کیں۔ اب یہ تمنا ہے:

امراؤ:

پھر مجھے کر بلا بلا بھیجیں

میری مٹی عزیز ہو جائے

مرزا صاحب میں اس ارادے سے گئی تھی کہ پھر کے نہ آؤں گی مگر خدا جانے کیا تھا کہ لکھنؤ سر پر سوار ہو گیا، مگر اب کی اگر خدا نے چاہا اور جانا ہو گیا، پھر نہ آؤں گی۔

۴

سن چکے حال تباہی کا مری اور سنو

اب تمہیں کچھ مری تقریر مزادیتی ہے

بونڈی سے بیگم صاحب اور برجیس قدر نیپال کو روانہ ہوئے۔ سید قطب الدین لڑائی میں مارے جا چکے تھے۔ میں بہ ہزار مشکل فیض آباد آئی۔ پہلے سرائے میں اتری، پھر ترپولے کے پاس ایک کمرہ کرائے کو لے لیا، میراثی نوکر رکھ لیے، گانا بجانا شروع کر دیا۔

فیض آباد میں رہتے ہوئے اب مجھے چھ مہینے گزر چکے ہیں۔ وہاں کی آب و ہوا طبیعت کے بہت موافق ہے۔ دل لگا ہے۔ آٹھویں دسویں کوئی نہ کوئی مجر آ جاتا ہے۔ اس پر بسر ہے۔ تمام شہر میں میرے گانے کی دھوم ہے۔ جہاں مجر ہوتا ہے ہزاروں آدمی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میرے کمرے کے نیچے لوگ تعریفیں کرتے ہوئے نکلتے ہیں۔ میں دل میں خوش ہوتی ہوں۔ کبھی کبھی خواب و خیال کی طرح بچپن کی باتیں بھی یاد آتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی دل میں ایک جوش سا پیدا ہوتا ہے۔ مگر انتزاع سلطنت، غدر، برجیس قدر یہ سب اسانچے آنکھوں کے سامنے گزر چکے ہیں۔ کلیجا پتھر کا ہو گیا ہے۔ ماں باپ کے تصور کے ساتھ ہی یہ خیال آتا ہے خدا جانے اب کوئی زندہ بھی ہو یا نہ ہو۔ اگر ہو تو اب ان کو مجھ سے کیا مطلب۔ وہ اور عالم میں ہوں گے۔ میں اور عالم میں ہوں۔ خون کا جوش سہی مگر کوئی غیرت دار آدمی مجھ سے ملنا گوارا نہ کرے گا۔ اب ان سے ملنے کی کوشش کرنا ان کو رنج دینا ہے۔ گھر کا خیال آتے ہی یہ باتیں دل میں آتی تھیں۔ پھر طبیعت اور طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔

لکھنؤ کی یاد اکثر ستاتی تھی، مگر جب انقلاب کا خیال آتا تھا، دل بھر جاتا تھا۔ اب وہاں کون ہے، کس کے لیے جاؤں، خانم جیتی ہیں تو کیا ہوا، ان سے اب کیوں کر بنے گی۔ وہ وہی اگلی حکومت

جتائیں گی۔ مجھے اب ان کی قید میں رہنا کسی طرح منظور نہ تھا۔ جو مال میر صاحب کی بہن کے پاس امانت تھا وہ اب کیا ملے گا۔ تمام لکھنولٹ گیا، میر صاحب کا گھر بھی لٹ گیا ہوگا۔ اس کا اب خیال ہی بے کار ہے۔ اور اگر نہیں لٹا تو ابھی اس کی ضرورت ہی کیا ہے، میرے ہاتھ گلے میں جو کچھ موجود ہے وہ کیا کم ہے۔

ایک دن کمرے میں بیٹھی ہوں۔ ایک صاحب شریفانہ صورت ادھیڑ سے تشریف لائے۔ میں نے پان بنا کر دیا، حقہ بھروا دیا۔ حالات دریافت کرنے پر معلوم ہوا، بہو بیگم صاحب کے عزیزوں سے ہیں، وثیقہ پاتے ہیں۔ میں نے باتوں باتوں میں مقبرے کی روشنی کی تمہید اٹھا کے پرانے ملازموں کا ذکر چھیڑا۔

میں: اگلے نوکروں میں اب کون کون رہ گیا ہے؟

نواب صاحب: اکثر مر گئے، نئے نئے نوکر ہیں۔ اب وہ کارخانہ ہی نہیں رہا، بالکل نیا انتظام ہے۔

میں: اگلے نوکروں میں ایک بڑھے جمعدار تھے۔

نواب: ہاں تھے، مگر تم کیا جانو؟

میں: غدر سے پہلے میں ایک محرم میں فیض آباد آئی تھی۔ مقبرے پر روشنی دیکھنے گئی تھی۔ انہوں نے میری بڑی خاطر کی تھی۔

نواب: وہی جمعدار نا! جن کی ایک لڑکی نکل گئی تھی؟

میں: مجھے کیا معلوم؟ (دل میں ہائے افسانہ اب تک مشہور ہے!)

نواب: یوں تو کئی جمعدار تھے اور اب بھی ہیں، مگر روشنی وغیرہ کا انتظام غدر سے پہلے وہی کرتے تھے۔

میں: ایک لڑکا بھی ان کا تھا۔

نواب: تم نے لڑکے کو کہاں دیکھا؟

میں: اسی دن ان کے ساتھ تھا۔ ایسی بھی شکل ملتے کم دیکھی ہے۔ بن کہے میں پہچان گئی تھی۔

نواب: جمعدار غدر سے پہلے ہی مر گئے، وہی لڑکا ان کی جگہ نوکر ہے۔

اس کے بعد بات ٹالنے کے لیے میں نے اور کچھ حالات ادھر ادھر کے پوچھے۔ نواب صاحب نے سوز پڑھنے کی فرمائش کی، میں نے دوسو سناے۔ بہت محظوظ ہوئے۔ رات کچھ زیادہ آگئی تھی، گھر تشریف لے گئے۔



باپ کے مرنے کا حال سن کر مجھے بہت رنج ہوا۔ اس دن رات بھر رویا کی۔ دوسرے دن بے اختیار جی چاہا بھائی کو جا کے دیکھ آؤں۔ دو دن کے بعد ایک مجرا آ گیا، اس کی تیاری کرنے لگی۔ جہاں کا مجرا آیا تھا وہاں گئی۔ محلے کا نام یاد نہیں۔ مکان کے پاس ایک بہت پرانی اہلی کا درخت تھا اسی کے نیچے نمکیرہ تانا گیا تھا۔ گرد قاتیں تھیں۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ مگر لوگ کچھ ایسے ہی ویسے تھے۔ قاتوں کے پیچھے اور سامنے کھریلوں میں عورتیں تھیں۔ پہلا مجرا کوئی نو بے شروع ہوا بارہ بجے تک رہا۔ اس مقام کو دیکھ کے وحشت سی ہوتی تھی۔ دل اٹھا چلا آتا تھا۔ صاف یہیں جی میں آتا تھا کہ یہیں میرا مکان ہے۔ یہ اہلی کا درخت وہی ہے جس کے نیچے میں کھیلا کرتی تھی۔ جو لوگ محفل میں شریک تھے۔ ان میں سے بعض آدمی ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے ان کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ شبہ مٹانے کے لیے میں قاتوں سے باہر نکلی۔ گھروں کی قطع کچھ اور ہو گئی تھی۔ اس سے خیال ہوا شاید یہ وہ جگہ نہ ہو۔ ایک مکان کے دروازے کو غور سے دیکھا کی۔ دل کو یقین ہو گیا تھا کہ یہی میرا مکان ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مکان میں تھسی چلی جاؤں ماں کے قدموں پر گر پڑوں وہ گلے لگالیں۔ مگر جرات نہ ہوتی تھی اس لیے کہ میں جانتی ہوں دیہات میں رنڈیوں سے بہت ہی پرہیز کرتے ہیں۔ دوسرے باپ بھائی کی عزت کا خیال تھا۔ نواب صاحب کی باتوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ جمعدار کی لڑکی کا نکل جانا لوگوں کو معلوم ہے۔ پھر جی کہتا تھا ہائے کیا غضب ہے! صرف ایک دیوار کی آڑ ہے۔ ادھر میری اماں بیٹھی ہوں گی اور میں یہاں ان کے لیے رُپ رہی ہوں۔ ایک نظر صورت دیکھنا ہی ممکن نہیں۔ کیا مجبوری ہے!

اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ ایک عورت نے آ کے پوچھا ”تمہی لکھنؤ سے آئی ہو؟“

میں: ہاں (اب تو میرا کلیجہ ہاتھوں اچھلنے لگا)

عورت: اچھا تو ادھر چلی آؤ، تمہیں کوئی بلاتا ہے۔

میں اچھا کہہ کر اس کے ساتھ چلی۔ ایک ایک پاؤں گویا سوسن کا ہو گیا تھا۔ قدم رکھتی کہیں تھی اور پڑتا کہیں تھا۔

وہ عورت اس مکان کے دروازے پر مجھ کو لے گئی جسے میں اپنا مکان سمجھے ہوئے تھی۔ اس مکان کی ڈیوڑھی میں ایک چارپائی پر مجھ کو بٹھا دیا۔ اندر کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا اس کے پیچھے دو تین عورتیں آ کر کھڑی ہوئیں۔

ایک: لکھنؤ سے تمہی آئی ہو؟

میں: جی ہاں۔

دوسری: تمہارا نام کیا ہے؟

۱۷۰ — امر او جان ادا

میں: (جی میں تو آیا کہہ دوں امیرن، مگر دل کو تھام کے) امر او جان۔

پہلی: تمہارا وطن خاص لکھنؤ ہے؟

میں: (اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، آنسو نکل پڑے) اصلی وطن تو یہی ہے، جہاں کھڑی ہوں۔

پہلی: تو کیا بنگلے کی رہنے والی ہو؟

میں: (آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے، بہ مشکل جواب دیا) جی ہاں۔

دوسری: کیا تم ذات کی پتیا ہو؟

میں: ذات کی پتیا تو نہیں ہوں، تقدیر کا لکھا پورا کر رہی ہوں۔

پہلی: (خود رو کے) اچھا تو روتی کیوں ہو؟ آخر کہو پھر تم کون ہو؟

میں: (آنسو پونچھ کے) کیا بتاؤں کون ہوں، کچھ کہتے بن نہیں پڑتا۔

اتنی باتیں میں نے بہت دل سنبھال کے کی تھیں۔ اب بالکل تاب ضبط نہ تھی، سینے میں دم رکنے لگا تھا۔

اتنے میں دو عورتیں پردے کے باہر نکلیں۔ ایک کے ہاتھ میں چراغ تھا، اس نے میرے منہ کو ہاتھ سے تھام کے کان کی لو کے پاس غور سے دیکھا اور یہ کہہ کر دوسری کو دکھایا، ”کیوں، ہم نہ کہتے تھے وہی ہے؟“

دوسری ”ہائے میری امیرن“ کہہ کے لپٹ گئی۔ دونوں ماں بیٹیاں چنچیں مار مار کے رونے لگیں، ہچکیاں بندھ گئیں۔ آخر دو عورتوں نے آ کر چھڑایا۔

اس کے بعد میں نے اپنا سارا قصہ دہرایا۔ میری ماں بیٹھی سنا کی اور رویا کی۔ باقی رات ہم دونوں وہیں بیٹھی رہیں۔ صبح ہوتے میں رخصت ہوئی۔ ماں نے چلتے وقت جس حسرت بھری نگاہ سے مجھے دیکھا تھا وہ نگاہ مرتے دم تک مجھے نہ بھولے گی، مگر مجبوری۔ روز روشن نہ ہونے پایا تھا کہ سوار ہو کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ دوسرا بھرا صبح کو ہوتا، مگر میں نے گھر پر آ کے کل روپیہ بھرے کا واپس دے دیا اور بیماری کا بہانہ کہلا بھیجا۔ دولہا کے باپ نے آدھا روپیہ پھیر دیا۔ اس دن دن بھر میرا جو حال رہا خدا ہی پر خوب روشن ہے۔ کمرے کے دروازے بند کر کے دن بھر پلنگ پر پڑی رویا کی۔

دوسرے دن شام کو کوئی آدھی رات گئے ایک جوان سا آدمی، سانولی رنگت، کوئی بیس بائی

سکاسن، پکڑی باندھے سپاہیوں کی ایسی وردی پہنے میرے کمرے میں آیا۔ میں نے حقہ بھروا دیا۔ پان دان میں پان نہ تھے، ماما کو بلا کے چپکے سے کہا پان لے آؤ۔ اتفاق سے اور کوئی بھی اس وقت نہ تھا، کمرے میں میں ہوں اور وہ ہے۔

جوان: کل سہی مجرے کو گئی تھیں؟ (یہ اس تیور سے کہا کہ میں جھجک گئی۔)

میں: ہاں  
اتنا کہہ کے اس کے چہرے کی طرف جو دیکھا، یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔

جوان: (سرنچا کر کے) خوب گھرانے کا نام روشن کیا؟  
میں: (اب سمجھی کہ یہ کون شخص ہے) اس کو تو خدا ہی جانتا ہے۔

جوان: ہم سمجھے تھے کہ تم مر گئیں مگر تم اب تک زندہ ہو۔  
میں: بے غیرت زندگی تھی، نہ مری۔ خدا کہیں جلد موت دے!

جوان: بے شک۔ اس زندگی سے موت لاکھ درجے بہتر تھی۔ تمہیں تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا تھا، یا کچھ کھا کے سو رہی ہو تیں۔

میں: خود اتنی سمجھ نہ تھی اور نہ آج تک کسی نے یہ نیک صلاح دی، اب سہی

جوان: اگر ایسی ہی غیرت دار ہوتیں تو اس شہر میں کبھی نہ آتیں اور آئی بھی تھیں تو اس محلے میں مجرے کو نہ آنا تھا جہاں کی رہنے والی تھیں۔

میں: ہاں اتنی خطا ضرور ہوئی، مگر مجھے کیا معلوم تھا۔

جوان: اچھا اب تو معلوم ہو گیا۔

میں: اب کیا ہوتا ہے۔

جوان: (بہت ہی غصہ ہو کے) اب کیا ہوتا ہے! اب کیا ہوتا ہے! اب

(چھری کمر سے نکال کے مجھ پر جھپٹا۔ دونوں ہاتھ پکڑ کے گلے

پر چھری رکھ دی) یہ ہوتا ہے۔ اتنے میں ماما بازار سے پان لے

کے آئی۔ اس نے جو یہ حال دیکھا لگی چیخنے۔ ”ارے دوڑ دو بیوی

کو کوئی مارے ڈالتا ہے۔“

جوان: (چھری گلے سے ہٹا کے ہاتھ چھوڑ دیئے) عورت کو کیا باروں  
اور عورت بھی کون بڑی..... اتنا کہہ کے دھاڑیں مار مار کے  
رونے لگا۔

میں پہلے ہی رو رہی تھی۔ جب اس نے گلے پر چھری رکھتی تھی جان کے خوف سے ایک دھچکا  
سا کیجے پر پہنچا تھا اس سے دم بخود سی ہو گئی تھی۔ جب وہ چھوڑ کے رونے لگا میں بھی رونے لگی۔  
ماما نے دو ایک چیخیں ماری تھیں۔ جب اس نے یہ حال دیکھا کچھ چپ سی ہو رہی۔ ادھر میں  
نے اشارے سے منع کیا۔ ایک کنارے کھڑی ہو گئی۔  
جب دونوں خوب رو دھو چکے۔

جوان: (ہاتھ جوڑ کے) اچھا تو اس شہر سے کہیں چلی جاؤ  
میں: کل چلی جاؤں گی مگر ایک مرتبہ ماں کو اور دیکھ لیتی۔  
جوان: بس اب دل سے دور رکھو معاف کرو۔ کل اماں نے تمہیں گھر پر  
بلا لیا میں نہ ہوا نہیں تو اسی وقت وار انیارا ہو جاتا۔ محلے بھر  
میں جڑے ہو رہے ہیں۔

میں: تم نے دیکھ لیا جان سے تو میں ڈرتی نہیں۔ مگر ہائے تمہاری  
جان کا خیال ہے۔ تم اپنے بچوں کے سر پر سلامت رہو! خیر اگر  
جیتے رہے تو کبھی نہ کبھی خیر و عافیت سن ہی لیا کریں گے۔  
جوان: برائے خدا کسی سے ہمارا ذکر نہ کرنا۔

میں: اچھا۔

وہ جوان تو اٹھ کے چلا گیا۔ میں اپنے غم میں مبتلا تھی ماما نے اور جان کھانا شروع کی۔ ”یہ  
کون تھے؟“

میں: رنڈی کے مکان پر ہزار آدمی آتے ہیں۔ کوئی تھے تمہیں کیا؟  
بہر طور ماما کو ٹال دیا۔ رات کی رات سو رہی صبح کو اٹھ کے لکھنو چلنے کی تیاری کی شاموں  
شام شکرم کرائے کر کے روانہ ہو گئی۔



حصہ سوم

۱

نہ پوچھو ہم سے کیونکر زندگی کے دن گزرتے ہیں  
لکھنؤ میں آ کر خانم کے مکان پر اتری۔ وہی چوک، وہی کمر، وہی ہم ہیں۔ اگلے آنے والوں میں سے کچھ لوگ کلکتے چلے گئے تھے، کچھ اور شہروں میں نکل گئے تھے۔ شہر میں نیا انتظام نئے قانون جاری تھے۔ آصف الدولہ کے امام باڑے میں قلعہ تھا۔ چاروں طرف دھس بنے ہوئے تھے۔ گول دروازے سے لے کر دریا تک دور دور مکان کھدے ہوئے پڑے تھے۔ جابجا چوڑی چوڑی سڑکیں نکل رہی تھیں۔ گلیوں میں گھر بنے بنائے جاتے تھے۔ نالے نالیاں صاف کی جاتی تھیں۔ غرضیکہ لکھنؤ اب اور ہی کچھ ہو گیا تھا۔

دو چار مہینے خانم کے مکان پر ہی رہی۔ اس کے بعد بہ لطائف الحیل ایک علیحدہ کمرالے کر رہنا شروع کیا۔ زمانے کے انقلاب کے ساتھ خانم کی طبیعت بھی کچھ بدل گئی تھی۔ مزاج میں ایک قسم کی بے پروائی سی ہو گئی تھی۔ جو رنڈیاں نکل کے علیحدہ ہو گئی تھیں۔ ان کا تو ذکر کیا، جو ساتھ رہتی تھیں ان کے روپے پیسے سے کوئی واسطہ غرض نہ تھی۔ میرا علیحدہ ہو جانا بھی کچھ ان کے مزاج کے خلاف نہ گزرا۔ دوسرے تیسرے دن میں جاتی تھی۔ سلام کر کے چلی آتی تھی۔ اس زمانے میں نواب محمود علی خاں صاحب سے مجھ سے تپاک بڑھا۔ پہلے کچھ دنوں تشریف لایا کیے۔ پھر نوکر رکھا، اس کے بعد مجھے پابند کرنا چاہا۔ بھلا مجھ سے کب ہو سکتا تھا کہ لکھنؤ میں رہوں اور اپنے قدیم ملنے والوں سے ملاقات ترک کر دوں۔ جب میں نے نواب صاحب کی طبیعت کا یہ رنگ دیکھا، ترک تعلق کرنا چاہا۔ نواب صاحب نے عدالت میں دعویٰ کر دیا کہ مجھ سے نکاح ہے۔ عجب آفت میں جان پھنسی۔ مقدمے کی پیروی میں ہزاروں صرف ہوئے۔ عدالت ابتدائی میں فیصلہ نواب صاحب کے موافق ہوا۔ اب مجھے روپوش ہونا پڑا۔ مدتوں چھپی چھپی پھری۔ وکیل کی معرفت اپیل کی۔ اپیل میں نواب صاحب ہارے۔ نواب صاحب نے عدالت عالیہ میں اپیل کی، یہاں بھی

ہارے۔ اب ناجائز دھمکیاں دینا شروع کیں۔ ”مار ڈالوں گا“ ناک کاٹ لوں گا۔“ اس زمانے میں مجھ کو جان کی حفاظت کے لیے دس بارہ آدمی لٹھ بند نوکر رکھنا پڑے۔ جہاں جاتی ہوں یہ آدمی فینس کے ساتھ ساتھ ہیں۔ ناک میں دم ہو گیا۔ آخر میں نے فوج داری میں مچلکے کا دعویٰ کیا۔ گواہوں سے ثابت کرادیا کہ بے شک نواب صاحب درپے آزار ہیں۔ حاکم نے نواب صاحب سے مچلکے لے لیا۔ اب جا کے جان چھوٹی۔ چھ برس تک ان مقدموں میں پھنسی رہی خدا خدا کر کے نجات ہوئی۔

جس زمانے میں نواب صاحب سے مقدمہ لڑ رہا تھا ایک صاحب اکبر علی خاں نامی مختار پیشہ چلتے پرزے آفت کے پرکالے ناجائز کارروائیوں میں مشاق جعل سازی میں استاد جھوٹے مقدمات بنانے میں وحید عصر عدالت کو دھوکہ دینے میں یکتائے زمانہ میری طرف سے پیروکار تھے۔ ان کی وجہ سے عدالتی کاموں میں بہت مدد ملی۔ حق تو یہ ہے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو میں نواب صاحب سے سربر نہ ہوتی۔ اگرچہ سچا واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب سے اور مجھ سے نکاح نہ تھا مگر عدالتوں میں اکثر سچی بات کے لیے بھی جھوٹے گواہ پیش کرنا ہوتے ہیں۔ فریق ثانی کی طرف سے بالکل جھوٹا دعویٰ تھا لیکن مقدمہ اس سلیقے سے بنایا گیا تھا کہ کوئی صورت مفکر کی نہ تھی۔ نکاح کے ثبوت میں دو مولوی پیش کیے گئے تھے جن کے ماتھوں پر گٹے پڑے ہوئے بڑے بڑے عمامے سر پر عبا میں زیب دوش ہاتھوں میں کنٹھے پاؤں میں کفشیں بات بات میں قال اللہ قال الرسول۔ ان کی صورت دیکھ کے حاکم عدالت کیا کسی نیک آدمی کو کذب و دروغ کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے ایک بزرگ ناک کے وکیل بنے تھے اور ایک منکوحہ کے مگر پھر حق حق ہے اور ناحق ناحق جرح میں بگڑ گئے۔ نواب کے اور گواہ ان سے زیادہ بگڑے اور انہی گواہوں کی گواہی سے نواب اپیل ہار گئے۔ فوج داری میں میری طرف سے جو گواہ پیش کیے گئے تھے وہ سب اکبر علی کے بنائے ہوئے تھے بالکل نہ بگڑے۔

اکبر علی خاں کی آمد و رفت میرے مکان پر بہت زمانے تک رہی۔ انہوں نے میرے ساتھ پورا حق دوستی کا ادا کیا۔ ایک شبہ نہیں لیا بلکہ اپنے پاس سے بہت کچھ صرف کیا۔ واقعی ان کو میرے ساتھ ایک قسم کی محبت تھی۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ برے آدمی بالکل برے نہیں ہوتے کسی نہ کسی سے بھلے ضرور ہو جاتے ہیں۔ اگلے زمانے کے چوروں کی نسبت آپ نے سنا ہوگا کہ جب کسی سے دوستی کر لیتے تھے تو اس سے پوزا نباہ کرتے تھے۔ بغیر کسی قدر بھلائی کے زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔

جو شخص سب سے برا ہو وہ کسی کا ہو کے رہے گا۔ جب تک نواب سے مقدمہ رہا، میں کسی اجنبی شخص کو اپنے پاس نہ آنے دیتی تھی، مبادا اس کا بھیجا ہوا ہو، خفیہ خبر لینے آیا ہو اور کسی طرح نقصان پہنچائے۔ اکبر علی خان ایک مرتبہ صبح کو کچہری جاتے وقت اور پھر شام کو کچہری سے پلٹ کے میرے مکان پر آتے تھے۔ شام کو یہیں نماز پڑھتے تھے۔ گھر سے کھانا آتا تھا۔ ہر چند میں نے اصرار کیا کہ مکان سے کھانا منگوانے کی کیا ضرورت، مگر انہوں نے نہ مانا۔ آخر مجبور ہو کے چپ ہو رہی۔ میرے گھر کے کھانے سے انکار بھی نہ تھا۔ میں بھی انہی کے ساتھ کھانا کھاتی تھی۔ اس زمانے میں میں بھی نماز کی پابند ہو گئی تھی۔ اکبر علی خاں کو تعزیر داری سے عشق تھا۔ رمضان اور محرم میں وہ اس قدر نیک کام کرتے تھے جس سے ان کے سال بھر کے گناہوں کی تلافی ہو جاتی تھی۔ یہ صحیح ہو یا غلط ان کا اعتقاد یہی تھا۔

رسوا: یہ معاملہ ایمان کا ہے اس لیے اتنا مجھے کہہ لینے دیجیے کہ یہ اعتقاد صحیح نہیں ہے۔

امراؤ: میرے نزدیک بھی ایسا ہی ہے۔

رسوا: عقل مندوں نے گناہ کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک وہ جن کا اثر اپنی ہی ذات تک رہتا ہے اور دوسرا وہ جن کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے، میری رائے ناقص میں پہلی قسم کے گناہ صغیرہ اور دوسری قسم کے گناہ کبیرہ ہیں (اگرچہ اور لوگوں کی رائے اس کے خلاف ہو) جن گناہوں کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے ان کی بخشش وہی لوگ کر سکتے ہیں جن پر ان کا برا اثر پڑا ہو۔ تم نے خواجہ حافظ کا وہ شعر سنا ہوگا۔

مے خورد مصحف بسوز و آتش اندر کعبہ زن

ساکن بت خانہ باش و مردم آزاری مکن

امراؤ جان! یاد رکھو مردم آزاری بہت ہی بری چیز ہے۔ اس کی بخشش کہیں نہیں ہے۔ اور اگر اس کی بخشش ہو تو معاذ اللہ خدا کی خدائی بے کار ہے۔



امراؤ: میاں میرا تو بال بال گناہ گار ہے، مگر اس سے میں بھی کانپتی ہوں۔

رسوا: مگر تم نے دل آزاری بہت کی ہوگی؟

امراؤ: پھر یہ تو میرا پیشہ ہے۔ اسی دل آزاری کی بدولت لاکھوں روپے ہم نے کمائے، ہزاروں اڑائے۔

رسوا: پھر اس کی کیا سزا ہوگی؟

امراؤ: اس کی سزا نہ ہونی چاہئے ہم نے جس قسم کی دل آزاری کی اس میں ایک طرح کی لذت ہے جو اس دل آزاری کا معاوضہ ہو جاتا ہے۔

رسوا: کیا خوب!

امراؤ: فرض کیجیے ایک صاحب نے ہم کو میلے تماشے میں کہیں دیکھ لیا، مرنے لگے۔ کوڑی پاس نہیں۔ ہم بے لیے مل نہیں سکتے۔ ان کا دل دکھتا ہے، پھر اس میں ہمارا کیا قصور! دوسرے صاحب ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ روپیہ بھی دیتے ہیں۔ ہم ایک اور شخص کے پابند ہیں یا ان سے ملنا نہیں چاہتے اپنا دل۔ ان کی جان پر زہنی ہے۔ پھر ہماری بلا سے۔ بعض ہمارے پاس اس طرح کے آتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ فقط ہمیں چاہو ہم نہیں چاہتے۔ اجارہ ہے؟ اس سے ان کو صدمہ پہنچتا ہے۔ پھر ہماری پاپوش سے۔

رسوا: یہ سب گولی مار دینے کے لائق ہیں۔ مگر برائے خدا! کہیں مجھے ان میں سے کسی میں شمار نہ کر لیجیے گا۔

امراؤ: خدا نہ کرے۔ آپ خوش باشوں میں ہیں۔ نہ آپ کسی کو چاہتے ہیں نہ کوئی آپ کو چاہتا ہے اور پھر آپ سب کو چاہتے ہیں اور سب آپ کو۔

رسوا: یہ کیا کہا؟ امکان بات سے اور نہیں بھی ہے۔ کہیں اس کا ہو سکتا ہے؟

امراؤ: میں منطق تو زیادہ پڑھی نہیں مگر ہو سکتا ہے۔ جب ایک بات کے دو پیرائے ہوں۔ ایک چاہنا عقل مندی کے ساتھ ہے اور ایک بے وقوفی کے ساتھ۔

رسوا: اس کی مثال؟

امراؤ: پہلے کی مثال چسپے آپ مجھ کو چاہتے ہیں میں آپ کو۔

رسوا: خیر میرے چاہنے کا حال تو میرا ہی دل جانتا ہے۔ اور آپ کے چاہنے کا حال آپ کے اقرار سے معلوم ہو گیا۔ آگے چلیے دوسری مثال۔

امراؤ: خیر اگر نہیں چاہتے تو میرا برا چاہتے ہوں گے۔ دوسرے کی مثال سنئے۔ جیسے فریادرس الہی۔

رسوا: نہیں اس مثال پر آپ نے غلطی کی۔ اور کوئی مثال دیجیے۔

امراؤ: اچھا جیسے قیس لیلیٰ کو چاہتا تھا۔

رسوا: آپ بھی کیا دنیاوی مثال ڈھونڈ کے لائی ہیں۔

امراؤ: اچھا جیسے..... نظیر.....

رسوا: (بات کاٹ کر) اس مثال سے معاف کیجیے اس موقع پر مجھ کو

ایک شعر یاد آیا ہے سن لیجیے اور اپنا قصہ دہرائیے۔

کیا کہوں تجھ سے محبت وہ بلا ہے ہدم

ہم کو عبرت نہ ہوئی غیر کے مرجانے سے

امراؤ: ہاں وہ کلکتے والا معاملہ؟

رسوا: اتنی دور کہاں پہنچ گئیں۔ کیا لکھنؤ میں ایسے نہیں رہتے؟

امراؤ: دنیا خالی نہیں ہے۔

رسوا: ہاں میں نے سنا تھا آپ اکبر علی خاں کے گھر بیٹھ گئیں تھیں؟

امراؤ: مجھ سے سنئے جس زمانے میں نواب عدالت ابتدائی سے جیت

گئے ہیں اور میں روپوش ہوئی ہوں اس زمانے میں اکبر علی خاں

مجھے اپنے مکان پر لے گئے تھے۔ کئی برس رہنے کا اتفاق ہوا۔  
اس زمانے میں تین آدمی اس دھوکے میں تھے کہ میں اکبر علی  
کے گھر بیٹھ گئی۔ ایک تو خود اکبر علی دوسرے ان کی بیوی  
تیسرے کا نام نہ بتاؤں گی۔

رسوا: میں بتا دوں؟

امراؤ: گوہر مرزا؟

رسوا: جی نہیں!

امراؤ: تو پھر اور کون؟ بتائیے۔

رسوا: آپ بتائیے۔

امراؤ: ایسے فقرے کسی اور کو دیتے ہیں۔

رسوا: فقرہ کیسا! میں ایک پرچے پر لکھ کے رکھ دیتا ہوں پھر آپ

بتائیے۔

امراؤ: بہتر۔

رسوا: پرچہ لکھ کے رکھ دیا۔ اب کہئے۔

امراؤ: تیسرے میں خود۔

(پرچے میں لکھا تھا ”آپ خود“)

امراؤ: واہ مرزا صاحب! خوب پہچانا۔

رسوا: آپ کی عنایت ہے۔ ہاں تو کیا گزری؟

امراؤ: گزری کیا، سنئے۔

اول تو انہوں نے مجھے ایک چھوٹے سے مکان میں لے جا کے اتارا جو ان کے مکان سے ملا  
ہوا تھا۔ کھڑکی درمیان تھی۔ موائے کچا سا مکان ایک چھوٹی سے دلیہ آگے چھپر۔ ایک اور چھپر  
سامنے پڑا ہوا۔ اس میں دو چولہے بنے ہوئے۔ یہ کیا ہے؟ باورچی خانہ اور سب خانے بھی ایسے  
ہی سمجھ لیجئے۔ اسی مکان میں میں بھی رہوں اور میاں کے بے تکلف دوست بھی آیا چاہیں۔ ان  
میں سے ایک صاحب رئیس موضع شیخ افضل حسین چھوٹے ہی ”بھوجی“ کہنے لگے۔ ان کے بے  
تکلف دوستوں کے ساتھ میں بھی رہتا تھا۔

گی؟“

ایک دن دو دن آخر مروت کہاں تک۔ انتہا یہ کہ پان دان میں نے ان کے آگے سرکا دیا۔ اس دن سے میں خود دست بردار ہو گئی۔ انہوں نے قبضہ کر لیا، جیسے کوئی مال موردی پر قبضہ کرتا ہے۔ پان اس بدتمیزی سے کھاتے تھے کہ دیکھنے والوں کو خواہ مخواہ نفرت ہو جائے۔ کتھے چونے کی کھٹیوں میں انگلیاں پڑ رہی ہیں، زبان سے چاٹ رہے ہیں۔ میں نے جب یہ قرینہ دیکھا، چکنی کے چورے اور لالہ پتھر پر بسر کرنے لگی۔ اس میں بھی وہ سا جھانگاتے تھے۔ ایک اور صاحب واجد علی نامی اکثر کھانے کے وقت ضرور تشریف لاتے تھے۔ اب یاد نہیں۔ اکبر علی خاں کے بردار نسبتی تھے۔ ان کے مذاق میں فحش حد اعتدال سے زیادہ تھا۔

ان دونوں صاحبوں کے سوا اکبر علی خاں کے بے تکلف احباب بہت سے تھے جن میں سے اکثر کو مقدمہ بازی کا شوق تھا۔ دن رات قانون چھٹا کرتا تھا۔ مگر جب مرزا صاحب تشریف لے جاتے تو اک ذرا امن ہو جاتا تھا، کیونکہ انہیں مقدموں کی باتیں سننے سے نفرت تھی۔

اس مکان سے چند روز کے بعد میری طبیعت حد سے زیادہ اکتا گئی۔ قریب تھا کہ کہیں اور رہنے کا بندوبست کروں، کہ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ اکبر علی کسی مقدمے میں فیض آباد گئے، افضل حسین اپنے گاؤں۔ اتفاق سے مکان میں کوئی نہیں ہے۔ دروازے کی کنڈی بند کر لی ہے۔ میں اکیلی بیٹھی ہوں کہ اتنے میں کھڑکی جوڑنا نے مکان کی دیوار میں تھی، کھلی اور اکبر علی خاں کی بیوی اندر چلی آئیں۔ مجھے خواہی نہ خواہی سلام کرنا پڑا۔ انگنائی میں تختوں کا چوکا بچھا تھا۔ اسی کے پاس میرا پلنگ لگا تھا۔ پہلے بڑی دیر تک چپکی کھڑی رہیں۔ آخر میں نے کہا۔ ”یا اللہ بیٹھ جائیے“ بارے بیٹھ گئیں۔

میں: ہم غریبوں پر کیا عنایت تھی۔ آج ادھر کہاں تشریف آئی۔

بیوی: تم کو میرا آنا ناگوار ہو تو چلی جاؤں۔

میں: جی نہیں، آپ کا گھر ہے۔ مجھے ایسا حکم تو مناسب بھی ہے۔

بیوی: لے باتیں نہ بناؤ۔ اگر میرا گھر ہے تو تمہارا بھی گھر ہے۔ اور ج

پوچھو تو میرا نہ تمہارا گھر تو گھر والے کا ہے۔

میں: جی نہیں! خدا رکھے آپ کے گھر والے کو ان کا بھی ہے اور آپ

کا بھی۔



بیوی: یہ تم اکیلی بیٹھی رہتی ہو۔ آخر ہم بھی آدمی ہیں۔ ادھر کیوں نہیں چلی آتیں۔ ہاں میاں کا حکم ہوگا۔

میں: میاں کا حکم کی کچھ ایسی تابع نہیں ہوں۔ ہاں آپ کی اجازت کی ضرورت تھی وہ حاصل ہوگئی۔ اب حاضر ہوں گی۔

بیوی: اچھا تو چلیے۔

میں: چلے

مکان میں جا کر دیکھتی ہوں خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ تانے کے مکے، دیگ، لگرے، پتیلیاں، لوٹے، نواڑی پلنگ، مسہری، تختوں کی چوکیاں، فرش فروش، مگر کسی بات کا قرینہ نہیں۔ انگنائی میں جا بجا کوڑا پڑا ہے۔ باورچی خانے میں سامنے بوا امیرن کھانا پکا رہی ہیں۔ مکھیاں بھن بھن کر رہی ہیں۔ تختوں کے چوکے پر پیک کے چکتے پڑے ہوئے ہیں۔ بیوی کے پلنگ پر منوں کوڑا، اما من نے پان دان لا کے بیوی کے سامنے رکھ دیا۔ کتھے چونے کے دھبوں میں سارا پان دان چھپا ہوا تھا۔ دیکھ کے میرا جی مالش کرنے لگا۔

بیوی نے پان لگا کے دیا، میں نے چٹکی میں دبا لیا، باتیں کرنے لگی۔ اسی اثنا میں محلہ کی ایک بڑھیا آنکلی۔ زمین پر پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی۔ بیوی سے (میری طرف) اشارہ کر کے پوچھا ”یہ کن ہیں؟“

بیوی: اب تمہیں کیا بتاؤں؟

میں چپکی بیٹھی رہی۔ بڑھیا (اکبر علی خان کی بیوی سے)

بڑھیا: اوکی! جیسے میں جانتی نہیں۔

میں: بڑی بی! پھر جانتی ہو تو پوچھنا کیا۔

بڑھیا: اوکی بی! تم سے بات نہیں کرتی۔ میں تو اپنی بہو صاحب سے

پوچھتی ہوں۔ میرا منہ تم سے بات کرنے کے لائق نہیں۔ تم

بڑی آدمی ہو۔

میں بڑھیا کا منہ دیکھ کے چپ ہو رہی۔

بیوی: اوکی بڑھیا! ذرا سی بات میں جھاڑ کا کاٹھا ہوگئی۔

بڑھیا: (بیوی سے) تم تو اس طرح بات چھپاتی ہو جیسے ہم دشمن ہیں۔

اے لوہم تو ان کی بھلائی کے لیے بات کرتے ہیں یہ ہمیں سے  
اے لے بگڑتی ہیں۔

بیوی: لے بس اپنی خیر خواہی رہنے دو۔ بوا! تم کسی کے گھر کی اجارہ دار  
ہو؟

بڑھیا: ہمارا اجارہ کیوں ہونے لگا۔ اب جوئی نئی آتی جائیں گی ان کا  
اجارہ ہوتا جائے گا۔

بیوی: بڑھیا کی اس بات پر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ منہ پھیر کے ہنسنے لگی۔  
کیوں نہیں اے تم بھی میری سوت ہونا (میری طرف مخاطب ہو  
کے) سن لو خان صاحب کی پہلی بیوی یہی ہیں۔ لو بیوی تم اصل  
میں ان کی سوت ہو۔ میں تو ان کے بعد آئی ہوں۔

بڑھیا: وہ سوت ہوں اپنے ہوتے سوتوں کی۔ مجھے یہ باتیں اچھی نہیں  
لگتیں۔ منہ در منہ گالیاں دیتی ہو۔ موئی کبھیوں خانگیوں کی  
صحبت میں اور کیا سیکھو گی۔ اتنے دن مجھے آئے ہوئے بڑی  
بیگم صاحب (اکبر علی خاں کی والدہ) نے آدھی بات مجھے نہیں  
کہی۔ بہو صاحب گنوتی ایسی ہیں کہ محلے کی بڑھیوں کو گالیاں  
دیتی ہوں۔

بیوی: (غصہ ہو کر) میں نے تم سے کہہ دیا دن کی ماں! تم آج سے  
میرے پاس نہ آنا۔ وہیں بڑی بیگم کے پاس جا کر بیٹھا کرو۔  
مجھے بھی بہت غصہ تھا مگر میں نے دیکھا کہ بے تکی عورت ہے۔ اس کے منہ کون لگے ضبط  
کر کے چپکی ہو رہی۔

بڑھیا: ہماری بلا آتی ہے.....

بیوی: موئی کی شامتیں آئی ہیں۔ یہ بلا بوغمہ کیا بک رہی ہے۔

بڑھیا: تو کیا تمہارے دبیل ہیں؟ کچھ کسی کے لینے میں نہیں۔ گھڑی بھر  
نکل آتے تھے۔ تم ہم سے ہم تم سے بات کرتے تھے۔ نہ آئیں  
گے۔

بیوی: ہرگز نہ آنا۔  
بڑھیا: اس ضد پر تو ضرور آئیں گے۔ دیکھیں تو تم ہمارا کیا بنا لیتی ہو۔  
بیوی: آؤ گی تو اتنی جوتیاں لگائیں گے کہ سر میں ایک بال نہ رہے گا۔  
بڑھیا: کیا تاکت کیا مجال۔ منہ بناؤ، جوتیاں ماریں گی، بڑی بے چاری۔

بیوی: لے اٹھو یہاں سے ٹہلو۔ نہیں تو لیتی ہوں ہاتھ میں جوتی۔  
بڑھیا: (ایک ٹھٹھا لگا کے) آج تو ہم جوتیاں کھا کے ہی جائیں گے۔  
مارو بڑے باپ کی بیٹی ہو تو۔

باپ کے نام پر بیوی کو غصہ آ گیا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ تھر تھر کاپنے لگیں۔  
بیوی: دور ہو یہاں سے کہتی ہوں۔

بڑھیا: اب تو ہم جوتیاں کھا کے ہی جائیں گے۔  
بیوی: (مجھ سے مخاطب ہو کے) دیکھو یہ مجھے ضد دلا رہی ہے۔ بے مارے موئی کو نہ چھوڑ دوں گی۔

میں: بیگم جانے دیجیے۔ موئی بے تکی ہے۔  
بڑھیا: (مجھ سے) تو کچھ نہ بولنا۔ مال زادی تجھے کچا ہی کھا جاؤں گی۔

بیوی: (جوتی پیر سے لے کر) ایک دو تین۔ اب راضی ہو؟

میں: بیگم جانے دیجیے۔ (ہاتھ سے جوتی چھین لی)

بیوی: نہیں تم نہ بولو۔ موئی کا کچومر نکال ڈالوں گی۔

بڑھیا: اور مارو۔

بیوی نے دوسرے پیر سے جوتی اتار کر چار پانچ اور لگائیں۔ اب تو بڑھیا نے زمین پر پاؤں پھیلا دیئے اور دو ہتھڑ مارنا شروع کیا۔ ”ہے! ہے! ہے! مجھے جوتیاں ماریں۔ اب تو دل ٹھنڈا ہوا۔ سوت کی چلن مجھ پر اتاری۔ ہائے مارا! ہائے مارا۔“ چلا چلا کے دہائی دینا شروع کی۔  
بادرچی خانے سے بوا امیرن اٹھ کے دوڑیں۔ بیگم صاحب اپنے دالان میں چلی آئیں۔ ایک آفت برپا ہو گئی۔ بڑی بیگم صاحب کو آتے دیکھ کر اور بھی دو ہتھڑ مارنا شروع کیے۔ ”اس بڑھاپے میں مجھے جوتیاں کھلاؤ نہیں۔“

بیگم صاحب: لے مجھے کیا معلوم تھا کہ تم پر جوتیاں پڑ رہی ہیں۔ نہیں تو آ کے بچا لیتی۔ آخر بات کیا ہوئی؟

بڑھیا: (میری طرف اشارہ کر کے) اس مال زادی نے مار کھلوائی۔  
ارے اس نے مار کھلوائی۔

میں ٹھگ ماری سی ہو گئی۔ بیگم صاحب سے مجھ سے اس وقت سامنا ہوا، کچھ کہتے نہیں بن پڑتا۔

بیوی: پھر ان کا نام لئے جاتی ہے۔

بڑھیا: ہم تو نام لیں گے۔ دیکھیں تم کیا کرتی ہو۔

بیگم صاحب: آخر ہوا کیا تھا؟

بڑھیا: مجھ نگوڑی نے اتنا پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ لے بھلا کیا گناہ کیا؟

بیوی: تم تو کہتی تھیں میں جانتی ہوں پر پوچھنے سے کیا مطلب تھا؟

بڑھیا: کیا مطلب تھا؟ اچھا مطلب بتا دوں گی۔ تو سہی جو اپنا عوض نہ لے لوں تم نے مارا تو ہے۔

بیگم: چل شنتل، تو کیا بدلہ لے گی؟ ذرا کسی بھلاوے پر نہ پھولنا۔

بڑھیا: میں تم سے کچھ نہیں کہتی۔ تم جو چاہو کہو۔ تمہارا بک ہے۔

بیگم: تیری بک والی کی ایسی کی تھی۔ نکل یہاں سے۔

بڑھیا: لو یہ بھی نکالتی ہوئی آئیں۔ اچھا جاتے ہیں۔

(یہ کہہ کے بڑھیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ لہنگا جھاڑ جھوڑ بڑ بڑاتی ہوئی) بڑی نکالنے والی۔ جاتے

ہیں۔ دیکھیں تو کیوں کر نہیں آنے دیتیں۔

بیگم: (بہو سے) آخر تم اس موئی چڑیل کے منہ کیوں لگیں؟

بیوی: اماں جان! آپ کے سر کی قسم! میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ تو

آپ ہی جیسے کوئی کھری کھاٹ پر سے سو کے آئی تھی۔ سینکڑوں

باتیں تو ان بے چاری کو سنا کے رکھ دیں۔

بیگم صاحب میرے ذکر پر کچھ ناک بھوں چڑھا کے چکی ہو گئیں۔ مجھ کو اس بڑھیا کی بات تو

ناگوار نہیں ہوئی، کیوں کہ میں اسے دیوانی سمجھتے ہوئے تھی، مگر ہاں بیگم صاحب کی بے اعتنائی سے



سخت صدمہ ہوا۔ وہ ابھی وہیں کھڑی تھیں کہ میں اٹھ کے کھڑکی کے پاس چلی آئی اور اپنے مکان میں آن بیٹھی۔

بیگم صاحب: (میرے چلے آنے کے بعد بہو سے) اوئی بیٹا! تم نے تو اس بڑھیا گھوڑی کو خواہ مخواہ پیٹ ڈالا پھر موئی ایک شنتل بازاری کے لیے۔ آخر تمہیں اس کی پرچک لینا کیا ضروری تھی۔

امیرن: اچھا اس کو جانے دیجیے۔ جیسی اس نے بدزبانی کی تھی اپنی سزا کو پہنچی۔ یہ پوچھیے کہ کسی خانگیوں سے میل جول کیسا؟ اور کسی بھی وہ جس سے میاں سے آشنائی ہو۔ ابھی وہ لا کے سر پر بٹھا دیتے تو کیسی کیسی مانا مت ڈالتی۔ اور خود فرض کر کے جا کے بلا لائیں؟

بیگم: (امیرن سے) اس کی مجال تھی گھر میں لے آتا۔ ہم نہیں بیٹھے ہیں۔ باہر جس کا جی چاہے آئے گھر میں کسی کا کیا کام ہے۔ اے لو ان سے (اکبر علی خاں کے باپ) برسوں حسین باندی سے ملاقات رہی۔ اس نے کیسی منتیں کیں۔ میں نے نہیں ہامی بھری۔ بوا امیرن! میں یہ سوچی کہ آج کو مہمان طریق کھڑی تڑی چلی آئے گی کل کو میاں گھر میں بٹھالیں گے۔ تو یہ چھاتی پر مونگ کون دلوائے گا۔ اپنی پت اپنے ہاتھ ہے۔ یہ آج کل کی لڑکیوں کو اپنے آگم اندیشے کا خیال نہیں۔

امیرن: سچ ہے بیگم صاحب! اول تو مونڈھے پر بیٹھے دایوں کا گھر گرہستیوں میں کام ہی کیا ہے۔ اگلے اوگ کہتے تھے۔ ایک درجہ مرد کو گھر میں بلا لے بدعورتوں کو نہ بلائے۔

بیگم: بوا! بات یہ ہے کہ مرد اگر چاہا بھی آئے گا تو کیا وہ عورتوں میں کھس کے بیٹھے گا۔ کل کی بات ہے بھاگڑ کے دنوں میں برسوں حسین خاں ہمارے گھر میں چھپے رہے۔ پھر بوا ایک گھر کا سہنا رہنا بگر مجال ہے کہ انہوں نے میرا آنچل تک دیکھا ہو یا بات

سنی ہو۔ دن دن بھر پچی میں گھٹی بیٹھی رہتی تھی۔ ماما اسیلوں سے اشاروں میں باتیں کرتی تھی۔

امیرن: ایک تو یہ کہ تم صحنک کی کھانے والی بیوی صاحب زادی۔ جب ایسوں کے پاس بیٹھو گی کہاں تک بچاؤ ہوگا۔ کہیں اس نے کتھے چوڑے کی کھیلوں میں ہاتھ ڈال دیا، تمہاری آنکھ بچا کے کٹوری میں پانی پی لیا! دوسرے موئی نکاہیاں ان کا ایثار (انتہار) کیا؟ سینکڑوں عارضوں میں گھری ہوتی ہیں۔ ان کی تو پر چھائیوں سے بچنا چاہیے۔

بیگم صاحب: ایک بات؟ کبھی باتوں کا براؤ ہونا چاہئے۔ پر چھانواں، ناکھن، ٹونے، ٹونے۔ بوا، کون کہے۔ ان کو تو سمجھ نہیں۔ اور جو کچھ کھلا ہی دے۔ مرزا محمود علی کی بہو کو سوت نے جو تک کھلا دی۔ دین و دنیا سے جاتی رہی۔ نہ آل کی نہ اولاد کی۔

امیرن: جی ہاں! اے اوکیا میں جانتی نہیں۔

بیگم: یہ سوتا پے کا اپنا رشتہ ہوتا ہے کہ اس میں جہاں تک الگ تھلک رہے اچھا۔ پون تو الگ تھلک رہنے پر بھی جان نہیں بچتی۔ جھی کو دیکھو۔ اس موئی ٹکے کی کہاری نے کیا کوئی بات اٹھا رکھی؟ دعا، تعویذ، گنڈے، کیسے کیسے نقش میرے سر ہانے سے نکلتے تھے۔

امیرن: پھر اس..... کو اپنے گھر میں کیوں آنے دیا۔

بیگم: اے بوا! نوکر تھی۔ میں کیا جانتی تھی کہ اس سے میاں سے لگا سکا

ہے۔ جس دن معلوم ہو گیا، میں نے کھڑے کھڑے نکال دیا۔

امیرن: مگر بیگم! ایک بات کہوں گی خدا لگتی۔ آپ کی خدمت بہت کی۔

بیگم: یہ خوب کہی۔ دیاں کو چھینا تھا۔ اب کیا اس سے بھی گئی گزری۔

اس بڑھیا کو کیا سمجھتی ہو؟ اس سے بھی کسی زمانے میں میاں سے نکلتی۔

امیرن: (تہقہ لگا کے) نہیں بیگم صاحب!  
بیگم: کیا میں جھوٹ کہوں گی؟ جب ہی تو وہ دہراتی تھی کہ اپنا عوض لے لوں گی۔

امیرن: بہو صاحب! تو پھر آپ کو نہیں چاہیے تھا۔ سرے کے حرم کو اتنی جوتیاں.....

بیگم: ہوا! ان لوگوں کو یہ لحاظ کہاں۔ سچ کہوں مجھے بھی یہ بات ناگوار ہوئی ان کے منہ پر کہتی ہوں۔ آج کو سوئی ٹکھائی کے چلتے سرے کی حرم کے جوتیاں ماریں، کل ساس کو ماریں گی۔

امیرن: نہیں خدانہ کرے۔ مگر ہاں بات کہنے ہی میں آتی ہے۔

ان دونوں بڑھیوں نے بہو صاحب بے چاری کو ایسے کوچے دیئے کہ آخر چٹخیں مار مار کے رونے لگی۔ میرا یہ حال تھا کہ انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ دونوں بڑھیوں کے منہ نوچ لوں۔

رسوا: ہائیں ہائیں یہ غصہ!

روکیے گا ذرا طبیعت کو

کہیں ایسا نہ ہو کہ خفت ہو

امراؤ: مرزا صاحب! غصے کی بات ہی تھی۔ ایک انسان کو اتنا ذلیل سمجھنا انسانیت سے بعید ہے۔

رسوا: میرے نزدیک تو کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر آپ کو اتنا غصہ آیا۔ وہ دونوں بڑھیاں سچ کہتی تھیں۔ اور بدن کی ماں بے چاری ناحق پٹی۔ حق تو یوں ہے اب آپ چاہے برا مانیں چاہے بھلا۔

امراؤ: واہ مرزا صاحب! آپ خوب انصاف کرتے ہیں۔

رسوا: جی ہاں میرے نزدیک انصاف یہی ہے۔ اس معاملے میں آپ بھی ایک حد تک بے قصور تھیں۔ سارا قصور اکبر علی کی بیوی کا

تھا۔

امراؤ:

ان بے چاری کا کیا قصور تھا؟

رسوا:

ایسا قصور تھا کہ اگر میری بیوی ایسا کرتی تو فوراً ڈولی بلوا کے میسے  
بھجوا دیتا اور چھ مہینے تک صورت نہ دیکھتا۔ اچھا ایک بات  
پوچھتے ہیں۔ اکبر علی خاں نے جب یہ واردات سنی تو کیا کہا؟

امراؤ:

مدن کی ماں پر خوب چیخے، خوب چلائے کہہ دیا خبردار! یہ ڈائن  
ہمارے گھر نہ آنے پائے۔ کئی مہینے تک اس کا آنا جانا موقوف  
رہا۔ جب بڑے خان صاحب آئے تو پھر آنے لگی۔ یہ قصہ ان  
کے آگے چھیڑا گیا تھا۔ وہ اگلے اکبر علی خاں کی بیوی پر خفا  
ہوئے۔

رسوا:

بڈھے کی عقل صحیح تھی۔

امراؤ:

صحیح تھی یا سٹھیا گئے تھے! ذرا مدن کی ماں پاؤں دبایا کرتی تھی،  
اسی سے اس کی پرچک لیتے تھے۔ کیوں نہ پرچک لیتے، مدنی  
ماں ان کی پرانی آشنا تھی۔

رسوا:

پھر آپ ہی قائل ہو جائیے۔ یہ عین وضع داری تھی۔ اچھا اب  
ایک بات اور بتا دیجیے۔ مدن کی ماں جوانی میں کوئی رنڈی تھی یا  
گھر گرہست۔ اور بوا امیرن کون تھیں؟

امراؤ:

مدن کی ماں موئی دھننی تھی۔ جوانی میں خراب ہو گئی تھی۔ بوا  
امیرن ایک دیہاتی عورت تھیں۔ ان کا مکان سندیلہ کے ضلع  
میں تھا۔ ایک جوان بیٹا تھا۔ وہ بھی بڑے خان صاحب کے  
پاس نوکر تھا۔ ایک لڑکی تھی۔ وہ کہیں باہر بیاہی ہوئی تھی۔

رسوا:

بوا امیرن سے اور بڑے خان صاحب سے تو کوئی تعلق نہ تھا۔

امراؤ:

نہ۔ خدا کو جواب دینا ہے۔ امیرن بڑی نیک عورت تھی۔ سارا

محلہ کہتا تھا کہ وہ جوانی میں رائڈ ہو کر یہاں نوکری کو آئی تھی۔

اسدن سے کسی نے اس کو بدراہ نہیں دیکھا۔



رسوا: پورے واقعات آپ کے بیان سے مجھ کو معلوم ہو گئے۔ اب پوچھئے کیا پوچھتی ہیں۔

امراد: تو کیا کوئی مقدمہ آپ فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں۔

رسوا: بہت بڑا مقدمہ ہے۔ بات یہ ہے کہ عورتیں تین قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک نیک، دوسری خرابیں، تیسری بازاریاں اور دوسرے قسم کی عورتیں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جو چوری چھپے عیب کرتی ہیں۔ دوسری وہ جو کھلم کھلا بدکاری پر اتار دیا جاتی ہیں۔ نیک بختوں کے ساتھ وہی عورتیں مل سکتی ہیں جو بدنام نہ ہو گئی ہوں۔ کیا تمہیں اتنی سمجھ نہیں ہے کہ وہ بیچاریاں جو تمام عمر چار دیواریوں میں قید رہتی ہیں۔ ہزار با قسم کی متبیتیں اٹھاتی ہیں، اچھے وقت کے تو سب ساتھی ہوتے ہیں، مگر برے وقت میں یہی بے چاریاں ساتھ دیتی ہیں۔

جس زمانے میں ان کے شوہر جوان ہوتے ہیں، دولت پاس ہوتی ہے، تو اکثر باہر دالیاں مزے اڑاتی ہیں، مگر مفلسی اور بڑھاپے کے زمانے میں کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ ان وقتوں میں وہی طرح طرح کی تکلیفیں اٹھاتی ہیں اور بروں کی جان کو صبر کرتی ہیں۔ پھر کیا انہیں اس کا کوئی فخر نہ ہوگا۔ یہی فخر اس کا باعث ہوتا ہے کہ وہ خراب عورتوں کو بہت ہی بری نگاہ سے دیکھتی ہیں، انتہا کا ذلیل سمجھتی ہیں۔ تو بہ استغفار سے خدا گناہ معاف کر دیتا ہے مگر یہ عورتیں کبھی معاف نہیں کرتیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ گھر کی عورت کیسی ہی خوبصورت، خوب سیرت اور خوش سلیقہ کیوں نہ ہو، بے وقوف مرد بازار یوں پر، جوان سے صورت اور دوسری صفتوں میں بدرجہا بدتر ہیں، فریفتہ ہو کر انہیں عارضی طور سے یا مدت العمر کے لیے ترک کر دیتے ہیں۔ اس لیے ان کو گمان کیا بلکہ یقین ہے کہ یہ کسی نہ کسی قسم کا جادو ٹوٹا ایسا کر دیتی ہیں جس سے مرد کی عقل میں فتور آ جاتا ہے۔ یہ بھی ان کی ایک قسم کی نیکی ہے، اس لیے کہ وہ اس حال میں بھی اپنے مردوں کو الزام نہیں دیتیں، بلکہ بدکار عورتوں ہی کو مجرم ٹھہراتی ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی محبت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

۱۹۰ — امراد جان ادا

امراد: یہ تو سب صحیح ہے، مگر مرد کیوں ایسے بے وقوف بن جاتے ہیں۔  
 رسوا: اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے مزاج میں جدت پسندی ہے۔  
 ایک حالت میں زندگی بسر کرنے سے خواہ وہ کیسی ہی عمدہ کیوں  
 نہ ہو، طبیعت اکتا جاتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کا  
 تغیر اس کی حالت زندگی میں پیدا ہو۔ شاہدان بازاری کے  
 ساتھ معاشرت کرنے میں اسے ایک قسم کی نئی لذت ملتی ہے جو  
 کبھی اس کے خیال میں نہ تھی۔ یہاں بھی ایک ہی کے تعارف  
 پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ جدت کی تلاش میں روز نئے کمروں میں  
 پہنچتا ہے۔ اور نئے گھر دیکھتا پھرتا ہے۔  
 مگر سب مرد ایسے نہیں ہیں۔

امراد: ہاں یہ سچ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حسن معاشرت کے قانون  
 رسوا: نے اس امر کو معیوب قرار دیا ہے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے اس کے  
 عزیز و اقارب، دوست احباب ملامت کرتے ہیں۔ اس خوف  
 سے اکثر کی جرات نہیں ہوتی۔ مگر جب اخوان الشیاطین کی  
 صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے، وہ طرح طرح کی لذتوں کا  
 ذکر کر کے ایک عجیب قسم کا شوق ان کی طبیعت میں پیدا کر دیتے  
 ہیں، اس لیے وہ خوف ان کے دل سے نکل جاتا ہے۔ آپ  
 کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہوا ہوگا کہ جو لوگ پہلے پہل  
 رنڈی کے مکان پر جاتے ہیں ان کو اخفائے راز کا کس قدر خیال  
 ہوتا ہے۔ کوئی دیکھتا نہ ہو، کوئی سن نہ لے۔ دو آدمیوں کے  
 سامنے تو بولنے کا کیا ذکر، تخیلہ میں بھی منہ سے بات نہیں نکلتی۔  
 مگر رفتہ رفتہ یہ حالت بالکل زائل ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ چند  
 ہی روز میں پورے بے غیرت ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر کیا ہے  
 دن دیہاڑے سرچوک رنڈیوں کے کمروں پر کھٹ کھٹ کر کے  
 چڑھ جانا، گاڑی میں کھڑکیاں کھول کے ساتھ بیٹھ کے سیر کرنا،

ہاتھ میں ہاتھ لے کے میلے تماشوں میں لیے پھرنا، ان سب باتوں کو فخر سمجھنے لگتے ہیں۔

امراؤ: یہ تو صحیح ہے، مگر شہروں میں ان باتوں کو چنداں معیوب نہیں سمجھتے۔

رسوا: خصوصاً دہلی اور لکھنؤ میں۔ اور یہی ان شہروں کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوا۔ دیہات اور قصبات میں ایسے شریر لوگوں کی صحبت کم ملتی ہے جو نو جوانوں کو ان بدکاریوں پر آمادہ کریں۔ دوسرے وہاں کی رنڈیوں کو اس قدر اختیار حاصل نہیں ہے۔ اس لیے وہ روستا اور زمینداروں کی مطیع فرمان ہوتی ہیں اور بہت ڈرتی ہیں، کیوں کہ ان کا آذوقہ بلکہ زندگی ان کے دست قدرت میں ہے۔ اس لیے ان کی اولاد سے بہت ہی چھپے چوری ملتی ہیں۔ اور شہروں میں تو آزادی ہے۔ کون کس کا دباؤ مانتا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے۔

امراؤ: مگر دیہاتی جب بگڑتے ہیں تو حد سے زیادہ بگڑ جاتے ہیں مثلاً میاں ارشاد علی کا واقعہ آپ سن چکے ہیں۔

رسوا: اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ان لذتوں سے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ جب ان کو ان کا چسکا پڑتا ہے تو وہ اس کی حد سے زیادہ قدر کرتے ہیں۔ اور اہل شہر کچھ نہ کچھ آگاہ ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو زیادہ شغف اور انہماک نہیں ہوتا۔

۲

جواں ہوتے ہی وہ تو اور ہی کچھ ہو گئے اے دل

رسوا: ہاں! وہ آپ کی نوچی کیا ہوئی؟ اے بھلا سا نام تھا۔

امراد: آبادی؟

رسوا: آبادی۔ صورت تو اچھی تھی۔ میں نے اس وقت دیکھا تھا جب اس کا سن دس بارہ برس کا تھا۔ جوانی میں تو اور نکھر گئی ہوگی۔

امراد: مرزا صاحب! آپ کو خوب یاد ہے۔

رسوا: یاد کو کیا چاہئے۔ واقعی میں بہت قطع دار عورت ہوگی۔ ہم بھی اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ کبھی تو جوان ہوگی۔

امراد: تو یہ کہیے کہ آپ بھی بی آبادی کے امیدواروں میں تھے۔

رسوا: سنو! امراد جان! میری ایک بات یاد رکھنا۔ جہاں کوئی حسین عورت نظر پڑے مجھے ضرور یاد کر لینا۔ اگر ممکن ہو تو امیدواروں میں نام لکھوادینا اور جو (خدا نخواست) میں مر جاؤں تو میرے نام پر فاتحہ دے دینا۔

امراد: اور اگر کوئی مرد حسین نظر آئے؟

رسوا: اپنا نام اس کے امیدواروں میں اور میرا نام اس کی بہن کے امیدواروں میں لکھوادینا، بشرطیکہ شرعاً ممنوع نہ ہو۔

امراد: کیا خوب! شرع کو کہاں دخل دیا ہے۔

رسوا: شرع کا دخل کہاں نہیں ہے۔ خصوصاً ہماری شرع جس میں کوئی فروگزاشت نہیں کی گئی۔

امراد: سیدھی سی ایک بات کیوں نہیں کہہ دیتے۔ ع

شرعاً تو جانتے نہیں عرفاً درست ہے

رسوا: یہ اور موقعوں پر کہا جاتا ہے۔ امراد جان! میری زندگی کا ایک اصول ہے۔ نیک بخت عورت کو میں اپنی ماں بہن کے برابر سمجھتا ہوں، خواہ وہ کسی قوم و ملت کی کیوں نہ ہو۔ اور ایسی حرکتوں سے مجھے سخت صدمہ پہنچتا ہے جو اس کی پارسائی میں خلل انداز ہوں۔ جو لوگ اس کو درغلائے یا بدکار بنانے کی کوشش کرتے ہیں، میری رائے میں قابل گولی مار دیئے کے ہیں۔ مگر فیاض



عورتوں کے فیض سے مستفید ہونا میرے نزدیک کوئی گناہ نہیں ہے۔

سبحان اللہ!

امراؤ:

خیر اب اس فضولیات کو رہنے دیجیے۔ آبادی جان کا حال کہیے۔

رسوا:

مرزا صاحب! اگر آپ اس کو جوانی کے عالم میں دیکھتے تو یہ شعر ضرور آپ کی زبان پر ہوتا۔

امراؤ:

جواں ہوتے ہی وہ تو اور ہی کچھ ہو گئے اے دل

کہاں کی پاک بازی، ہم بھی اب نیت بدلتے ہیں

جوان ہو کے اس نے وہ شکل و صورت نکالی تھی کہ سو پنچاس رنڈیوں میں ایک تھی۔

اب کیا ہوئی۔ خدا کے لیے جلدی کہیے۔ مرج شہر چلی گئی، مر گئی،

رسوا:

آخر آفت ہی کیا ہوئی جو آپ ایسی مایوسی کے کلمات کہتی ہیں۔

ہم سے گئی جہان سے گئی۔

امراؤ:

آخر ہے اب کہاں؟

رسوا:

اسپتال میں ہے اور کہاں ہے۔

امراؤ:

یہ کہیے گل جوانی شگفت۔

رسوا:

جی ماشاء اللہ سے خوب پھلیں پھولیں۔ صورت بگڑ گئی، رنگت الٹا

امراؤ:

توا ہو گئی، ناک بیٹھ گئی، تمام بدن میں چٹھے پڑ گئے، بال گر گئے،

غرضیکہ ستر کرم ہو گئے۔ اب جان کے لالے پڑے ہیں۔

یہ ہوا کیا تھا؟

رسوا:

اے ہے ہوا کیا تھا۔ موٹی لونڈوں گھیری، سفلی، چھپھوری۔ میں

امراؤ:

نے بہت چاہا کہ آدمی بنے مگر نہ بنی۔ میں نے کیا نہیں کیا۔

استاد کو نوکر رکھا، تعلیم دینا شروع کی، مگر اس کا دیدہ ایسی باتوں

میں کب لگتا تھا۔ جب سے جوان ہوئی، میں نے کمر اعلیٰ جدہ کر دیا

تھا۔ شہر کے چند ذات شریف آ کے بیٹھنے لگے۔ دن رات گالم

گلوچ، دھینکا مشتی، جو تم جاتا۔ ایک آفت برپا رہتی تھی۔ ناک میں دم ہو گیا تھا۔ کسی پر بند نہیں۔ جو آیا وارد۔ میں نے مارا، پیٹا، سمجھایا، مگر وہ کب سنتی تھی۔ پچھنے ہی سے اس کی نگاہ بد تھی۔ اس زمانے میں بوا حسینی کا نواسہ جمن آیا کرتا تھا۔ اس سے کھیلا کرتی تھی۔ میں نے خیال کیا بچے ہیں، کھیلنے دو۔ آخر کچھ باتیں آنکھ سے دیکھیں کہ جمن کی آمد و رفت موقوف ہوئی۔ ایک صاحب میرے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔ ذرا خوش گلو تھے۔ میں گویا کرتی تھی۔ ان سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ وہ شریف خاندان سے تھے مگر طبیعت پا جی تھی۔ نہ میرا لحاظ کیا، نہ اپنی حیثیت دیکھی۔ ایک دن سر شام کیا دیکھتی ہوں، ڈیوڑھی میں بی آبادی سے باتیں ہو رہی ہیں۔

چھٹن صاحب: اری میں تو تیری صورت کا عاشق ہوں۔ ہائے آبادی کیا کروں۔ امر او جان سے ڈرتا ہوں۔

آبادی: ہٹو! ایسی باتیں مجھ سے نہ کیا کرو۔ ڈر کا ہے کا؟

چھٹن نے آبادی کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا ”ظالم کیا پیاری پیاری صورت ہے۔“

آبادی: پھر تمہیں کیا؟

چھٹن: (ایک بوسہ لے کر) ہمیں کیا؟ جان جاتی ہے، مرتے ہیں۔

آبادی: موئے چار آنے تو دیئے نہیں جاتے، مرتے ہیں! مرتے سب کو

دیکھا، جنازہ کسی کا نہیں دیکھا۔

چھٹن: چار آنے؟ جان حاضر ہے۔

آبادی: گلوڑی جان کو میں لے کر کیا کروں گی؟

چھٹن: لوہاری جان کسی کام کی ہی نہیں۔

آبادی: لے اب باتیں نہ بناؤ۔ چوٹی جیب میں پڑی ہو تو دیتے جاؤ۔

چھٹن: واللہ! اماں کی تنخواہ نہیں ہٹی۔ پرسوں ضرور ضرور لیتا آؤں گا۔

آبادی: اچھا تو جان چھوڑو جاؤ۔

چھٹن: اچھا تو ایک بوسہ تو اور دے دو۔

آبادی کو چھٹن نے گلے لگایا۔ آبادی نے ان کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کہیں اتفاق سے تین پیسے پڑے ہوئے تھے نکال لیے۔

چھٹن: تمہیں ہمارے سر کی قسم! یہ پیسے نہ لینا۔ باجی نے رنگ کی پڑیاں اور سی منگائی ہے۔

آبادی: تمہارے سر کی قسم! میں تو نہ دوں گی۔

چھٹن: آخر کیا کرو گی۔ پرسوں چونی لے لینا۔

آبادی: واہ! خاکینہ لیں گے۔

چھٹن: تین پیسے کا خاکینہ! اچھا ایک پیسہ لے لو۔

آبادی: تین پیسے کا خاکینہ کچھ بہت ہوا؟ گلوڑا بہت دن سے جی چاہتا

ہے۔ بیوی لینے نہیں دیتیں۔ کہتی ہیں پیٹ میں درد ہوگا۔ میں تو

ایک دن چھپا کے ایک آنے کا خاکینہ کھا گئی کچھ بھی نہیں ہوا۔

(میں نے دل میں کہا کیوں نہ ہو۔ موئی کال کی ماری بلا نوش۔ ہم تو ذرا سا بھی کھالیں تو بد

ہضمی ہو جائے۔)

رسوا: کیا اسے کال میں لیا تھا؟

امراؤ: جی ہاں! ایک روپیہ کو ماں بچ گئی تھی۔ تین دن کے فاقے سے

تھی۔ میں نے روٹی کھلائی اور ایک روپیہ دیا۔ مرزا صاحب

مجھے بڑا ترس معلوم ہوا۔ میں نے تو کہا تھا میرے پاس رہ مگر

نہ رہی۔

رسوا: کم بخت کبھی پھر بھی آئی تھی؟

امراؤ: جی! کئی دفعہ آئی۔ لڑکی کو دیکھ کے بہت خوش ہوئی۔ مجھ کو

دعائیں دیتی تھی۔ سال میں ایک دو مرتبہ آ جایا کرتی تھی۔ مجھ

سے بھی جو کچھ ہو سکتا تھا سلوک کرتی تھی۔ اب کئی برس سے

نہیں آئی خدا جانے جیتی ہے یا مر گئی ہے۔

رسوا: ذات کیا تھی؟

پاسی۔

امراؤ:

رسوا:

اچھا تو وہ قصہ تو رہ گیا۔ چھٹن نے چونی دی یا نہیں۔

امراؤ:

میری جانے بلا۔ چھٹن کے جانے کے بعد میں نے منہ ہی منہ میں موٹی کو خوب کچلا۔ پیسے چھین کے چوک میں اچھا دیے۔

میرے کمرے کے برابر ایک اور چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کوئی دو روپے مہینے کرائے کا۔ اس میں ایک رنڈی آ کے رہی تھی حسنا۔ ابھی جوان تھی۔ اس کی اور آبادی کی پرگت خوب ملی۔ دن بھر وہیں بیٹھی رہا کرتی تھی۔ ساری خصائیں حسنا کی اس نے اختیار کر لیں۔ جیسی وہ رنڈی تھی ویسے ہی اس کے آشنا۔ ایک آیا پاؤ بھر پوریاں تیل کی لیے چلا آتا ہے۔ دوسرا پچاس آم دو آنے سینکڑہ کے لیتا آیا۔ کسی سے دو گز نینوں کی فرمائش ہے۔ مخملی بوٹ کا چونگا ہے۔ میلے تماشے میں دو چار گرگے ساتھ ہیں۔ بڑے بڑے صافے بندھے ہوئے۔ کف دار کرتے یا انگرکھے کمر کے پاس سے چست۔ کوئی دھوتی باندھے ہے، کوئی چست گھٹنا ڈانٹے ہے۔ ہاتھ میں لٹھے ہے، گلے میں ہار پڑے ہوئے۔ بی حسنا ٹھک ٹھک ان کے ساتھ چل رہی ہیں۔ ہرن والی سرا میں جا کے ایک بوتل ٹھرے کی رڑی۔ وہاں سے چلے تو جھومتے جھامتے، لڑکھڑاتے، ناچتے، گاتے۔ بی حسنا ابھی اس کی بغل میں تھی ابھی اس کے گلے میں ہاتھ۔ سر راہ گالم گلوچ، نوچم کھسوٹ، جوتم جاتا ہو رہا ہے۔ اس حالت میں دو ایک تو رستے میں گر پڑے، تین چار میلے تک پہنچے۔ وہاں چرس پر دم پڑے۔ ان میں سے جو کوئی ہوشیار ہوا اس نے بی حسنا کو گانٹھ لیا، اور یاروں کو دھتا بتائی۔ اپنے گھر لے گیا یا انہی کے کمرے پر آ کے ٹھہرا اور یار جب میلے سے پلٹ کے آئے، کمرے کے نیچے کھڑے چیخ رہے ہیں، گالیاں دے رہے ہیں، ڈھیلے مار رہے ہیں۔ بی حسنا اول تو کمرے میں نہیں اور ہیں بھی تو بولیں کیوں۔ اتنے میں کوئی برق انداز چلا آیا۔ اس نے مجمع خلاف قانون کو برہم کیا، سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

بس یہی انداز آبادی بھی چاہتی تھی۔ بھلا میں اس کی کب روادار ہوتی۔ آخر حسین علی (میرے پاس ایک نواب صاحب آیا کرتے تھے، ان کے خدمت گار کا نام تھا) کے ساتھ نکل گئیں۔ اس کے گھر جا کے بیٹھیں۔ وہاں اس کی جو رو نے قیامت برپا کی، گھر سے نکل گئیں۔ میاں حسین علی ان پر لٹو تھے۔ بیوی کے نکل جانے کی انہیں پرواہ نہ ہوئی، مگر مشکل یہ درپیش ہوئی کہ اب کھانا کون پکاوے۔ بی آبادی کو چولہا پھونکنا پڑا۔ یہ اس کی کب عادی تھی۔ بہر طور چند روزیوں



گزرے۔ یہیں ایک بچہ جنیس۔ خدا جانے حسین علی کا تھا یا کسی اور کا۔ دو مہینے کا ہو کے وہ بچہ جاتا رہا۔ ادھر حسین علی کی کی جو رو نے روٹی کپڑے کا دعویٰ کیا۔ ڈیڑھ روپے مہینے کی ڈگری ہو گئی۔ تین روپے نواب دیتے تھے۔ ڈیڑھ روپے میں کیا ہوتا۔ اوپر کی آمدنی پر بسر تھی۔ اس میں بھی کچھ نہ چلی۔ بی آبادی کسی قدر چٹوری بھی تھیں۔ آخر میاں حسین علی کے گھر سے نکل کے محلے کے ایک لڑکے کے منے کے ساتھ بھاگیں۔ اس لڑکے کی ماں پٹھانی، کٹنی بڑی مشہوروں میں تھی۔ جہاں دو چار لقمہ دریاں اور رہتی تھیں وہیں ان کا بھی ٹھکانا ہو گیا۔ بی پٹھانی کی روزی میں کسی قدر وسعت ہوئی۔ منے برائے نام رہ گئے۔ میاں منے کے ایک پیر بھائی میاں سعادت پٹھانی کو جل دے کے انہیں وہاں سے لے اڑے۔ یہ اپنی ماں کے پاس لے گئے۔ ان کی والدہ کو مرغیوں سے شوق تھا۔ مکان کے پاس ایک تکیہ تھا۔ وہاں مرغیاں چرا کرتی تھیں۔ بی آبادی ان کی حفاظت پر متعین ہوئیں۔ میاں سعادت کسی کارخانے میں کام کرتے تھے۔ دن بھر وہاں چلے جاتے تھے۔ یہ مرغیاں ہنکایا کرتی تھیں۔ وہاں انہوں نے محمد بخش گلو کھنڈن کے بیٹے سے راہ ورسم پیدا کی۔ بلکہ سعادت کی ماں نے یہ معاملہ دیکھ بھی لیا۔ بیٹے سے کہا۔ اس نے خوب جوتے مارے۔ میاں محمد بخش کے ایک اور یار تھے میاں امیر۔ نواب امیر مرزا کے خدمت گاروں میں نوکرتھے۔ یہ فن تماش بینی میں طاق تھے اڑالے گئے۔ انہوں نے ایک مکان میں لے جا کے رکھا۔ یہاں اور یاروں کا مجمع بھی رہتا تھا۔ بی آبادی سب کی دل جوئی میں مصروف رہتیں۔ اس زمانے میں نہیں معلوم کس کی برکت سے خوب پھلیں پھولیں۔ اب میاں امیر کے کس کام کی تھیں۔ اس نے اٹھا کے اسپتال میں پھنکوا دیا۔ بالفعل وہیں تشریف رکھتی ہیں۔ اگر آپ فرمائیے تو بلوادی جائیں۔

رسول: مجھے معاف ہی کیجیے۔

۳

ہاتھ آئی مراد منہ مانگی

دل نے پائی مراد منہ مانگی

رجب کی نوچندی تھی۔ کچھ بیٹھے بیٹھے میرے دل میں آئی، چلو درگاہ چلیں، زیارت ہی

کریں۔ سرشام سوار ہو کے پہنچے۔ بڑا مجمع تھا۔ پہلے تو مردانی درگاہ کے صحن میں ادھر ادھر ٹہلا کی۔ پھر جا کے شمعیں جلائیں، حاضری چڑھائی۔ ایک صاحب مرثیہ پڑھ رہے تھے انہیں سنا۔ پھر ایک مولوی صاحب آئے۔ انہوں نے حدیث پڑھی۔ اس کے بعد ماتم ہوا۔ اب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلنے لگے۔ میں نے بھی زیارت رخصتی پڑھ کے واپسی کا ارادہ کیا۔ دروازے تک پہنچ کے جی میں آیا زبانی درگاہ میں بھی ہوتی چلوں۔ نوحہ خوانی کی شہرت اور نواب ملکہ کشور کی سرکار سے توسل کی وجہ سے اکثر عورتیں مجھ کو جانتی تھیں۔ میں نے خیال کیا کہ دو چار مل ہی جائیں گی۔ اسی بہانے سے ملاقاتیں ہو جائیں گی۔ سوار ہو کے چو پہلے پر پردہ ڈال کے زبانی درگاہ کے دروازے پر پہنچی۔ محل دار نے آ کر سواری اتروائی۔ اندر گئی۔ میرا خیال غلط نہ تھا۔ اکثر عورتوں سے سامنا ہوا۔ شکوے، شکایتیں، غدر کے حالات، ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں۔ بڑی دیر ہو گئی۔ میں واپس آنے ہی کو تھی کہ اتنے میں دیکھتی کیا ہوں، دہنی طرف کی چچی سے کان پور والی بیگم صاحب نکلی چلی آتی ہیں۔ بڑے ٹھاٹھ ہیں، تولواں جوڑا پہنے ہوئے، چار پانچ مہریاں ساتھ ہیں۔ ایک پائینچے سنبھالے ہوئے ہے، ایک کے ہاتھ میں پنکھیا ہے، ایک لوٹیا خاص دان لیے ہے، ایک کے پاس سینی میں تبرکات ہیں۔ مجھے دور سے دیکھتے ہی دوڑیں۔ کندھے پر ہاتھ رکھ دیئے۔

بیگم: اللہ امر او! تم تو بڑی بے مروت ہو۔ کان پور سے جو غائب ہوئیں تو آج ملی ہو وہ بھی اتفاق سے۔

میں: کیا کہوں۔ جس دن آپ کے باغ میں رات کو رہی تھی، اسی دن صبح کو لکھنؤ سے لوگ آ کے مجھے پکڑ کے لکھنؤ لے گئے۔ پھر بھاگڑ ہوئی۔ خدا جانے کہاں کہاں ماری ماری پھری۔ نہ مجھے آپ کا پتا تھا نہ آپ کو میرا حال معلوم تھا۔

بیگم: خیر اب تو ہم تم دونوں لکھنؤ میں ہیں۔

میں: لکھنؤ کیسا اس وقت تو ایک ہی مقام پر ہیں۔

بیگم: اس کی سند نہیں۔ تمہیں میرے مکان پر آنا ہوگا۔

میں: سر آنکھوں سے۔ مگر آپ رہتی کہاں ہیں؟

بیگم: چوٹیوں پر۔ نواب صاحب کو کون نہیں جانتا۔ پوچھنے ہی کو تھی کہ کون نواب صاحب اتنے میں ایک مہری بول انھی ”نواب محمد تقی

خاں کا مکان کون نہیں جانتا۔“

میں: آنے کو تو آؤں مگر نواب صاحب کے خلاف نہ ہو۔

بیگم: نہیں۔ وہ اس طبیعت کے آدمی نہیں ہیں۔ اور پھر تمہارے

واسطے؟ میں نے اس رات کا حال رتی رتی ان سے کہا تھا۔

انہوں نے خود تمہیں کان پور میں کئی دفعہ ڈھنڈوایا۔ اکثر پوچھتے

رہتے ہیں۔

میں: اچھا تو ضرور آؤں گی۔

بیگم: کب آؤ گی؟ وعدہ کرو۔

میں: اب کی جمعرات کو حاضر ہوں گی۔

بیگم: ادنیٰ۔ یہ جمعرات کی ارواح تم کب سے ہو گئیں۔ ابھی تو

پورے آٹھ دن ہیں۔ ادھر ہی کیوں نہیں آتیں؟

میں: اچھا تو اگلی پیر کو آؤں گی۔

بیگم: اتوار کو آؤ۔ نواب بھی گھر میں ہوں گے۔ پیر کے دن شاید کسی

انگریز سے ملنے چلے جائیں۔

میں: مناسب ہے اتوار ہی کو سہی۔

بیگم: کس وقت آؤ گی؟

میں: جس وقت کہیے۔ مجھے گھر پر کوئی کام نہیں، ہر وقت برابر ہے۔

بیگم: تم کہاں رہتی ہو؟

میں: چوک میں سید حسن خاں کے پھانک کے پاس۔

بیگم: اچھا تو میں مہری کو بھیج دوں گی۔ اسی کے ساتھ چلی آنا۔

میں: یہ بہت اچھا ہے۔

بیگم: اچھا تو خدا حافظ!

میں: خدا حافظ! ہاں تو کہیے، صاحب زادہ کیسا ہے؟

بیگم: عین؟ ماشاء اللہ اچھا ہے۔ لواب تم نے یاد کیا۔

میں: کیا کہوں، باتوں میں کیسی بھولی۔ اور بھولی کیا، جب چاہتی تھی

پوچھوں ایک نہ ایک بات نکل آتی تھی۔

اب تو سلامتی سے ذرا ہوش سنبھالا ہے۔ اچھا اس دن اسے بھی دیکھ لینا۔

بیگم:

رات کی نیند حرام۔ لے اب کچھ نہ کہئے۔ خدا حافظ!

میں:

خدا حافظ۔ دیکھو ضرور آتا۔

بیگم:

ایسی بات ہے؟

میں:

اتنے میں مہری نے دیکھا کہ باتوں کا سلسلہ پھر چلا کہنے لگی ”بیگم صاحب! چلیے دیر سے سواری لگی ہے۔ کہا رموئے چلا رہے ہیں۔“

۴

ہر چند بہت غور کیا ہم نے شب و روز

دنیا کا طلسمات سمجھ میں نہیں آتا

میں خانم سے علیحدہ ہو گئی تھی، مگر جب تک وہ جیتی رہیں انہیں اپنا سر پرست سمجھا کی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انہیں بھی مجھ سے محبت تھی۔ ان کے پاس اس قدر دولت تھی کہ طبیعت غنی ہو گئی تھی۔ سن جو زیادہ ہو گیا تھا تو دنیا کی طرف سے انکی طبیعت پھر گئی تھی۔ اب ان کو کسی کی کمائی سے کچھ مطلب نہ تھا، مگر محبت اسی طرح کرتی تھی۔ وہ اپنے جیتے جی کسی نوچی کو اپنے ساتھ سے جدا نہ سمجھتی تھیں، مجھ سے تو ان کو خاص محبت تھی۔ بسم اللہ نے ان کو بہت آزار دیئے اس لیے اس سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ لیکن پھر اولاد تھی۔ خورشید جان بھی غدر کے بعد آ گئی تھیں۔ وہ خانم کے پاس رہتی تھیں۔ امیر جان نے علیحدہ کمرالے لیا تھا، مگر وہ بھی آتی جاتی رہتی تھیں۔

جو کمر خانم نے مجھے دیا تھا وہ ان کی زندگی بھر مجھ سے خالی نہیں کرایا گیا۔ میرا اسباب اس میں بند رہتا تھا۔ میرا قفل لگا تھا۔ جب جی چاہتا تھا دو دو تین تین دن وہیں جا کے رہتی۔ سال بھر کہیں رہوں، مگر محرم میں تعز یہ داری وہیں کرتی تھی۔ میرے نام کا تعز یہ خانم مرتے دم تک رکھا کیں۔



جمرات کو بیگم سے ملاقات ہوئی تھی۔ جمعے کو آدمی آیا کہ خانم صاحب کی طبیعت کچھ علیل ہے، تمہیں یاد کرتی ہیں۔ میں فوراً سوار ہو کے گئی۔ انہیں دیکھ کے گھر پر واپس آنے کا ارادہ تھا کہ جی میں آیا ایک بھاری جوڑا نکالتی چلوں۔ کمر اکھولا۔ دیکھا کمرے میں چاروں طرف جالے لگے ہوئے ہیں۔ پلنگ پر منوں گرد پڑی ہے۔ فرش فروش الٹا پڑا ہے۔ ادھر ادھر کوڑا پڑا ہے۔ یہ حال دیکھ کے مجھے اپنے اگل دن یاد آئے۔ اللہ ایک وہ دن تھا کہ یہ کمر اہر وقت کیسا سجا سجا رہتا تھا۔ دن میں چار مرتبہ جھاڑو ہوتی تھی۔ بچھونے جھاڑے جاتے تھے۔ گرد کا نام تک نہ تھا۔ تنکا تک کہیں پڑا نہ رہتا تھا۔ اب یہ حال ہے کہ دم بھر بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہی پلنگ جس پر میں سوتی تھی اب اس پر قدم رکھتے ہوئے کراہت معلوم ہوتی ہے۔ آدمی ساتھ تھا۔ میں نے اس سے کہا ”ذرا جا لے تو لے لے۔“ وہ ایک سیٹھا کہیں سے ڈھونڈ کے اٹھالایا۔ جالے لینے لگا۔ اتنی دیر میں میں نے اپنے ہاتھ سے دری الٹی۔ آدمی نے اور میں نے مل کر دری بچھائی۔ چاندنی کو ٹھیک کیا۔ جب فرش درست ہو گیا تو میں نے پلنگ کے بچھونے اٹھوا کے جڑوائے۔ کوٹھڑی میں سے سنگار دان، پان دان، اگال دان اٹھالائی۔ سب چیزیں اپنے اپنے قرینے سے لگا دیں، جس طرح کسی زمانے میں لگی رہتی تھیں۔ خود پلنگ سے تکیہ لگا کے بیٹھی۔ آدمی کے پاس خاص دان تھا۔ پان لے کے کھایا۔ آئینہ سامنے لگا کے منہ دیکھنے لگی۔ اگلا زمانہ یاد آ گیا۔ شباب کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ اس زمانے کے قدر دانوں کا تصور بندھ گیا۔ گوہر مرزا کی شرارت، راشد کی حماقت، فیضو کی محبت، سلطان صاحب کی صورت، غرضیکہ جو جو صاحب اس کمرے میں آتے تھے، مع اپنے اپنے خصوصیات کے میرے پیش نظر تھے۔ وہ کمر اس وقت فانوس خیال بن گیا تھا۔ ایک تصویر آنکھ کے سامنے آتی تھی اور غائب ہو جاتی تھی۔ پھر دوسری سامنے آتی تھی۔ جب کل صورتیں نظر سے گزر گئیں تو یہ دور از سر نو پھر شروع ہوا۔ پھر وہی صورتیں ایک دوسرے کے بعد پیش آئیں۔ پہلے تو ایسے دور جلد جلد ہوئے اب ذرا توقف ہونے لگا۔ اب مجھ کو ہر تصویر پر زیادہ تردد و فکر کرنے کا موقع ملا۔ جو واقعات جس شخص کے متعلق تھے ان پر تفصیلی نظر پڑنے لگی۔ پہلے دماغ کو چکر ہوا تھا، تو صرف چند ہی تصویریں نظر آتی تھیں۔ اب ہر تصویر سے بہت سی نکلیں اور فانوس خیال کی وسعت بڑھنے لگی۔ تمام زندگی میں جو کچھ دیکھا سب نگاہ کے سامنے تھا۔ اس اثنا میں ایک مرتبہ سلطان صاحب کا پھر خیال آیا تو اس کے ساتھ ہی پہلے مجرے کا تمام جلسہ، جس میں سلطان صاحب کو دیکھا اور دوسرے دن ان کے خدمت گار کا آنا، پھر ان کا خود تشریف لانا، مزے مزے کی باتیں، شعرو سخن کا چرچا،

خان صاحب کا محل صحبت ہونا، بدزبانی کرنا، سلطان کا تنچہ مارنا، خان صاحب کا گر پڑنا، شمشیر خاں کی جان نثاری، کوتوال کا آنا، خان صاحب کو گھر پر بھجوا دینا، مگر پھر سلطان صاحب کا نہ آنا، محفل میں ان کو دیکھنا، لڑکے کے ہاتھ رقعہ بھیجنا، پھر از سر نو رسم ہونا، نواز گنج کے جلسے، یہ سب واقعات اس طرح سے معلوم ہوتے تھے جیسے کل ہوئے ہیں۔ یہ دورے برابر چل رہے تھے۔ مگر جب پہلے بحرے کے بعد سلطان صاحب کے آدمی کا پیام لے کے آنا یاد آتا تھا تو طبیعت کچھ رک سی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس موقع پر کچھ چھوٹ جاتا ہے۔ اتنے میں آدمی نے زور سے ایک چیخ ماری۔

آدمی: بیوی! دیکھئے وہ کنکھجور! آپ کے دوپٹے پر چڑھا جاتا ہے۔

میں ادنیٰ کہہ کے اٹھی۔ جلدی سے دوپٹا اتار کے پھینک دیا۔ الگ جا کھڑی ہوئی۔ آدمی نے دوپٹا اتار کے جھاڑا۔ کنکھجور اپٹ سے گرا اور رینگ کے پلنگ کے سرہانے پائے کے نیچے گھس گیا۔ آدمی نے پلنگ کا پایہ اٹھایا۔ اب جو دیکھتے ہیں تو پائے کے نیچے پانچ اشرفیاں برابر بچھی ہوئی ہیں۔

آدمی: (بہت ہی متعجب ہو کے) ہائیں! اے لیجئے یہ کیا ہے!

میں: (دل میں) اہاہ! اشرفیاں ہیں! (آدمی سے) اشرفیاں ہیں!

آدمی: واہ! اشرفیاں یہاں کہاں سے آئیں؟

میں: (ہنس کے) وہ کنکھجور! اشرفیاں بن گیا۔ اچھا اٹھا لو۔

آدمی پہلے تو جھجکا، پھر پانچوں اشرفیاں مجھے حوالے کیں۔

رسوا: تو کیا خانم کا مکان غدر میں نہیں لٹا؟

امراؤ: لٹا کیوں نہیں۔ مگر فرض کر لیجے کہ میرے پلنگ کا پایہ کسی نے اٹھا

کے نہیں دیکھا۔

رسوا: ممکن ہے۔

## ۵

کسی طرح سے ہو تسکین شوق کیسا رشک

ملیں گے آج ہم ان سے رقیب سے مل کے

اتوار کے دن ۸ بجے صبح کو بیگم صاحب کی مہری فینس اور کھار لے کے سر پر نازل ہو گئی۔ میں ابھی سو کے اٹھی تھی۔ اچھی طرح حقہ پینے بھی نہ پائی تھی کہ اس نے جلدی مچانا شروع کر دی۔ میں سمجھتی تھی کھانا دانا کھا کے جانا ہوگا۔ مہری نے کہا۔ ”بیگم صاحب نے اپنے سر کی قسم دی ہے کہ کھانا یہیں آ کے کھانا۔“ میں نے پوچھا ”نواب صاحب گھر پر ہیں؟“ اس نے کہا۔ ”نہیں۔ صبح اٹھ کے گاؤں کو سدھلے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔ ”کب آئیں گے؟“ مہری نے کہا۔ ”اب آئیں تو کہیں شام کو آئیں۔“ مجھے بیگم سے تھلیے میں بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ اس لیے فوراً اٹھ بیٹھی۔ ہاتھ منہ دھو، کنگھی چوٹی کر، کپڑے پہن، ایک ماما کو ساتھ لے کے روانہ ہو گئی۔

جا کے جو دیکھا، بیگم صاحب منتظر بیٹھی ہیں۔ میرے جانے کے ساتھ دسترخوان بچھا۔ میں نے اور بیگم صاحب نے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھایا۔ بہت تکلف کا کھانا کھایا۔ پرانٹھے، قورمہ، کئی طرح کا سالن، بالائی، مہین چادلوں کا خشک، نورتن چٹنی، سیب کا مربہ، حلوہ سوہن، کھانا کھا کے چپکے سے میرے کان میں۔

بیگم: کیوں وہ کریم کے گھر کی ارہر کی دال اور جوار کی روٹیاں بھی یاد

ہیں؟

میں: چپ بھی رہو۔ کہیں کوئی سن نہ لے۔

بیگم: سن لے گا تو کیا ہوگا۔ کیا کوئی جانتا نہیں۔ نواب کی ماں (خدا

جنت نصیب کرے) نے مجھے نواب کے لیے مول لیا تھا۔

میں: برائے خدا چپ رہو۔ کہیں علیحدہ چلو تو باتیں ہوں گی۔

کھانا کھا کے منہ ہاتھ دھویا، مہری نے حقہ لا کے لگایا۔ بیگم نے سب کو یہاں سے ٹال دیا۔

میں: بارے تم نے مجھے پہچان لیا۔

بیگم: جب تمہیں پہلے پہل کانپور میں دیکھا تھا، اسی دن پہچان لیا تھا۔

پہلے تو بڑی دیر تک الجھن سی رہی تھی۔ دل میں کہتی تھی میں نے انہیں کہیں دیکھا ہے۔ مگر کہاں دیکھا ہے؟ کیوں کر دیکھا ہے؟ یہ کچھ یاد نہیں آتا تھا۔ چاروں طرف خیال دوڑائی تھی، کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا۔ اتنے میں کریم مہری پر نظر پڑی۔ کریم کے نام پر مونڈی کاٹے کریم کا نام یاد آ گیا۔ دل نے کہا۔ اوہو انہیں کریم کے مکان پر دیکھا تھا۔

میں: میرا بھی یہی حال تھا۔ بڑی دیر تک غور کیا کی۔ میری ساتھ والیوں میں خورشید ہے۔ اس کی صورت تم سے بہت ملتی ہے۔ جب میں خورشید کو دیکھتی تھی، تم یاد آ جاتی تھیں۔

بیگم: اب میرا حال سنو۔

میں تم سے جدا ہو کے نواب صاحب کی ماں نواب عذرا بیگم صاحب کے ہاتھ بکی ہوں۔ تمہیں یاد ہو گا میرا سن کوئی بارہ برس کا ہو گا۔ نواب کو سولہواں برس تھا۔ نواب کے ابا جان کانپور میں رہتے تھے۔ بیگم صاحب سے ان سے نا اتفاقی رہتی تھی، نواب صاحب کے ابا جان نے نواب کی شادی اپنی بہن کی لڑکی کے ساتھ ٹھہرائی تھی۔ ان کا مکان دہلی میں تھا۔ بیگم صاحب کو وہاں شادی کرنا منظور نہ تھا۔ وہ یہ چاہتی تھیں کہ نواب کی شادی ان کے بھائی کی لڑکی کے ساتھ ہو۔ میاں بیوی میں پہلے ہی سے نا اتفاقی تھی اس بات سے اور ضدیں بڑھیں۔ ابھی یہ جھگڑا طے نہ ہوا تھا کہ نواب کے دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز ہوئی۔ حکیموں نے تجویز کیا کہ بہت جلد شادی کر دینا چاہئے ورنہ جنون ہو جائے گا۔ شادی ہو جانا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اتنے میں میں پہنچ گئی۔ بیگم صاحب نے مجھے خرید لیا۔

نواب صاحب مجھ پر مائل ہو گئے اور ایسے مائل ہوئے کہ دونوں جگہ کی شادی سے کھلم کھلا انکار کر دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ بیگم صاحب نے انتقال کیا اور اس کے بعد چند ہی سال بعد بڑے نواب بھی مر گئے۔ ماں باپ دونوں صاحب جائیداد تھے۔ یہی ایک اکلوتے لڑکے تھے۔ کل دولت انہی کو ملی۔

نواب صاحب کو خدا سلامت رکھے جن کی بدولت میں بیگم صاحب بنی ہوئی ہوں اور چین کرتی ہوں۔ نواب مجھے اسی طرح چاہتے ہیں جیسے کوئی اپنے سہرے جلوے کی بیوی کو چاہتا ہے۔



۲۰۵ — امراد جان ادا

میری ظاہر میں تو کبھی کسی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ یوں باہر اپنے دوستوں آشاؤں میں جو کچھ چاہتے ہوں کرتے ہوں۔ آخر مرد ذات ہیں۔ کچھ ان کے پیچھے پیچھے تو پھرتی نہیں۔

خدا نے سب آرزوئیں میری پوری کیں۔ اولاد کی ہوس تھی خدا کے صدقے سے اولاد بھی ہے۔ اب اگر آرزو ہے تو یہ کہ خدا بن کو پروان چڑھائے۔ بہو بیاہ لاؤں اور ایک پوتا کھلاؤں۔ پھر چاہے مر جاؤں۔ نواب کے ہاتھوں مٹی عزیز ہو جائے۔ اب تم اپنا حال کہو۔

جب رام دئی یہ باتیں کر رہی تھی مجھے اپنی قسمت پر افسوس آ رہا تھا اور دل ہی دل میں کہتی تھی تقدیر ہو تو ایسی ہو۔ ایک میری پھوٹی تقدیر کی بھی تو کہاں رنڈی کے گھر میں۔ اس کے بعد میں نے اپنا مختصر حال کہہ سنایا جس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ میں دن بھر وہیں رہی۔ جب تخلیہ کی باتیں ہو چکیں نوکروں کو آواز دی۔ طبلے کی جوڑی، ستار، طنبورہ یہ سب سامان منگایا۔ گانے بجانے کا جلسہ ہوا۔

جب ہم دونوں اکیلی تھیں تو وہ رام دئی تھی اور میں امیرن، سب لوگوں کے سامنے وہ پھر بیگم صاحب ہو گئیں اور میں امراد جان۔ تین چار گھنٹے تک گانا بجانا ہوتا رہا۔ بیگم بھی کسی قدر ستار بجالیتی تھیں۔ جب میں گا چکتی تھی تو ستار کی وہ کوئی گت چھیڑ دیتی تھیں۔ ایک مغلانی کا گلا بہت اچھا تھا اس کو گویا، سر شام تک بڑے لطف کی صحبت رہی۔

۶

ہاں اے نگاہ شوق مناسب ہے احتیاط

ایسا نہ ہو کہ بزم میں چرچا کرے کوئی

قریب شام محل میں نواب صاحب کی آمد آمد کا غل ہوا۔ وہ بے تکلفی کی صحبت برہم ہو گئی۔ طبلے کی جوڑی، ستار، طنبورہ، سب چیزیں ہٹا دی گئیں۔ چھپنے والیاں اٹھ اٹھ کے پردے میں جانے لگیں۔ اور سب لوگ اپنے اپنے قریب سے ہو گئے۔ میں بھی بیگم سے الگ ہٹ کر مقطع بن کے بیٹھ گئی۔ جس دالان میں ہم لوگ بیٹھے تھے وہاں سے دروازے کا سامنا تھا۔ پردہ پڑا ہوا تھا۔ نواب کے انتظار میں اس پردے کی طرف نگاہیں لگی ہوئی تھیں۔ میں بھی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔

اتنے میں کسی خدمت گار نے چلا کر کہا۔ ”نواب صاحب تشریف لائے ہیں۔“ چند لمحے کے بعد مہری نے پردہ اٹھا کے کہا۔ ”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔“ نواب اندر داخل ہوئے۔  
میں (صورت دیکھتے ہی دل میں) وہی تو ہیں (سلطان صاحب) ہے ہے! کس موقع پر سامنا ہوا ہے۔ نواب کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ پہلے تو کچھ جھجکے پھر بغور میری طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ میں بھی انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں دیکھتا ہوں جوان کی طرف تو حیرت سے

مری نگاہ کا وہ اضطراب دیکھتے ہیں

اب نواب دالان کے قریب پہنچ گئے اور میری طرف دیکھتے جاتے تھے کہ

بیگم: اوئی نواب دیکھتے کیا ہو؟ یہ وہی ہیں امراد جان جو کان پور.....

نواب: (انجان بن کے) میں نے تم سے انہی کا تذکرہ کیا تھا۔

اب فرش کے قریب پہنچ گئے۔ سب تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ نواب مسند پر بیگم کے پہلو میں اک ذرا سرک کے بیٹھ گئے۔

اب شام ہو گئی تھی۔ مہری نے دو کنول سفید روشن کر کے سامنے رکھے۔ بیگم پان بنانے لگیں۔ اس اثنا میں نواب نے آنکھ بچا کے میری طرف دیکھا۔ میں نے کنکھیوں سے انہیں دیکھا۔ اب نہ وہ کچھ کہہ سکتے ہیں نہ میں بول سکتی ہوں۔ منہ سے بولنے کا تو موقع نہ تھا مگر اس وقت آنکھیں زبان کا کام دے رہی تھیں۔ شکوے شکایت رمز و کنایہ سب اشاروں میں ہوا۔

نواب: (کسی قدر اجنبیت سے) امراد جان صاحب! واقعی ہم تو

آپ کے بہت ہی ممنون ہیں۔ واقعی کان پور میں اس شب کو تمہاری وجہ سے ہمارا گھر لٹنے سے بچ گیا۔

میں: یہ آپ کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ ایک اتفاقی امر تھا۔

نواب: خیر وہ کچھ ہو وجہ تمہاری تھی۔ خیر اسباب تو وہاں کچھ نہ تھا مگر ایک

خیریت ہو گئی۔ تمام ضروری کاغذات کوٹھی میں موجود تھے۔

میں: یہ حضور ان دنوں جنگلے میں عورتوں کو چھوڑ کے کہاں گئے تھے؟

نواب: کیا کہوں! ایسی ہی مجبوری تھی۔ لکھنؤ کی جائیداد بادشاہ نے ضبط کر

لی تھی۔ لاٹ صاحب کے پاس کلکتے جانا ضرور تھا۔ ایسی عجلت میں گیا تھا کہ نہ کچھ سامان کیا نہ لیا نہ دیا۔ صرف شمشیر خاں اور ایک آدمی اور ساتھ لے کے چلا گیا۔

میں: وہ کوٹھی ایسے جنگل میں ہے کہ جو واردات ہو تعجب ہے۔

نواب: سوائے اس واقعے کے اور کوئی واردات نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ

غدر ہونے کو تھا۔ بد معاشوں نے سراٹھایا تھا۔ ملک میں اندھیر مچا ہوا تھا۔

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں۔ پھر دسترخوان بچھا۔ سب نے ساتھ مل کے کھانا کھایا۔ جب حقہ پان سے فراغت ہو چکی نواب نے گانے کی فرمائش کی۔ میں نے یہ غزل شروع کی۔

مرتے مرتے نہ تضا یاد آئی  
اسی کافر کی ادا یاد آئی  
تم کو الفت نہ وفا یاد آئی  
یاد آئی تو جفا یاد آئی  
ہجر کی رات گزر ہی جاتی  
کیوں تری زلف رسا یاد آئی  
موت تم سے بھی سوا یاد آئی  
لذت معصیت عشق نہ پوچھ  
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی  
چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا  
لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

اور شعر یاد نہیں۔ مقطع یہ ہے۔

کیا غزل کوئی کہی ہے.....  
آخ کیوں باد صبا یاد آئی

۷

جھولا کن ڈارورے امراں

برسات کے دن ہیں۔ پانی چھما چھم برس رہا ہے۔ آموں کی فصل ہے۔ میرے کمرے میں مجمع ہے۔ بسم اللہ جان، امیر جان، بیگا جان، خورشید جان، رنڈیوں میں۔ نواب بن صاحب، نواب چھٹن صاحب، گوہر مرزا، عاشق حسین، تفضل حسین، امجد علی، اکبر علی خاں، مردوں میں۔ یہ سب صاحب موجود ہیں، گانا ہو رہا ہے۔ اتنے میں۔

بسم اللہ جان: بھئی ہوگا۔ گانا تو روز ہوا کرتا ہے۔ اس وقت تو کڑھائی چڑھاؤ۔ کچھ پکوان پکواؤ۔ دیکھو کیسا مینہ برس رہا ہے۔

میں: اونہ۔ بازار سے جو جی چاہے منگوا لو۔

خورشید: بازار سے منگواؤ، خوب کہی۔ اپنے ہاتھ سے پکانے میں مزا ہی اور ہے۔

امیر: بہن! تمہیں ہنڈیا ٹھونکنے کا مزا ہے۔ ہم نے نہ تو کبھی پکایا ہے نہ پکانے کی قدر جانتے ہیں۔

بیگا: تو پھر وہی بازار کی ٹھہری

میں: اے ہے باجی کیا بھوکی ہو؟

بیگا: میں تو بھوکی نہیں ہوں۔ بسم اللہ سے پوچھو جس نے صلاح دی تھی۔

بسم اللہ: بھئی کچھ نہ کچھ تو آج ہونا چاہئے۔

میں: میں بتاؤں! چلو بخشش تالاب چلیں۔

بسم اللہ: ہاں بھئی کیا بات کہی ہے۔

خورشید: خوب سیر ہوگی۔

بیگا: ہم بھی چلیں گے۔

میں: اچھا تو سامان کرو۔



بات کرتے تین گاڑیاں کرایہ پر آگئیں۔ کھانے پکانے کا سامان گاڑیوں پر لدوا دیا گیا۔ دو چھولداریاں نواب بن صاحب کے گھر سے آگئیں۔ سب گاڑیوں پر سوار ہو کے روانہ ہو گئے۔ گوشتی پار پیچ کے گانا شروع ہوا۔ اس دن بیگا جان کا گانا۔

جھولا کن ڈارورے امریاں

کیا کیا تانیں لی ہیں۔ دل پسا جاتا تھا۔

شہر سے نکل کے جنگل کا سماں قابل دید تھا۔ جدھر نگاہ جاتی ہے سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ بادل چاروں طرف گھرے ہوئے ہیں۔ مینہ برس رہا ہے۔ درختوں کے پتوں سے پانی ٹپک رہا ہے۔ نالے، ندیاں، جھیلیں بھری ہوئی ہیں۔ مورناچ رہے ہیں، کوئل کوک رہی ہے۔ بات کہتے ہیں تالاب پر پہنچ گئے۔ بارہ دری میں فرش کیا گیا۔ چولہے بن گئے، کڑھائیاں چڑھ گئیں۔ پوریاں تلی جانے لگیں۔ نواب چھٹن صاحب بارانی پہن کے شکار کو نکل گئے۔ گوہر مرزا آموں کی کھانچیاں چکالائے۔ اتنی دیر میں نوکروں نے سڑک کے کنارے باغ میں چھولداریاں گاڑ دیں۔ گاؤں سے چار پائیاں آگئیں۔ یہاں اور ہی لطف تھا۔ آم ٹپک رہے ہیں۔ ایک ایک آم پر چار چار آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ پانی میں چھپکے لگا رہے ہیں۔

کوئی ادھر دوڑا جا رہا ہے، کوئی ادھر۔ آپس میں دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔ اب اس میں اگر کوئی گر پڑا تو کیچڑ میں لت پت، تھوڑی دیر میں پانی میں جا کے کھڑے ہو گئے۔ پھر ویسے ہی صاف۔ جن کے مزاج میں کسی قدر احتیاط تھی، جیسے باجی بیگا جان، وہ چھولداری میں بیٹھیں رہیں۔ بسم اللہ نے پیچھے سے جا کے منہ پر آم کا رس مل دیا۔ پھر ان کی چنچیں اور سب کا تہقبہ لگانا دیکھنے کا تماشا تھا۔

نہیں معلوم کہاں سے بہتی بہاتی تین نٹیاں آنکلیں۔ ان کو گوانا شروع کیا۔ ان کے ساتھ ڈھونگی والا غضب کی ڈھونگی بجاتا تھا۔ ان کا ناچ گانا ہم لوگوں کو کیا اچھا معلوم ہوتا۔ مگر اس موسم میں اور ویسی جگہ کچھ ایسا نامناسب نہ تھا۔ دو گھڑی دن رہے ہماری قسمت سے آسمان کھل گیا، دھوپ نکل آئی۔ ہم لوگ احتیاطاً ایک ایک جوڑا گھر سے لیتے آئے تھے۔ سب نے کپڑے بدلے۔ جنگل کی سیر کو نکلے۔

میں بھی اکیلی ایک طرف کو روانہ ہوئی۔ سامنے گنجان درخت تھے۔ سورج انہی گنجان درختوں کی آڑ میں ڈوب رہا تھا۔ سبزے پر سنہری کرنوں کے بڑنے سے عجب کیفیت تھی۔ جا بجا

جنگی پھول کھلے تھے۔ چڑیاں سبزے کی تلاش میں ادھر ادھر اڑ رہی تھیں۔ سامنے جھیل کے پانی پر آفتاب کی شعاع سے وہ عالم نظر آتا تھا جیسے پگھلا ہوا سونا تھلک رہا ہے۔ درختوں کے پتوں کی آڑ میں سورج کی کرنیں اور ہی عالم دکھا رہی تھیں۔ آسمان پر سرخ شفق پھولی ہوئی تھی۔ اس وقت کا سماں ایسا نہ تھا کہ خفقاتی مزاج کی عورت جیسی کہ میں ہوں، جلدی سے چھو لداری میں چلی آتی۔ یہ تماشہ دیکھتی ہوئی خدا جانے کتنی دور نکل گئی۔ آگے جا کر ایک کچی سڑک ملی۔ اس پر کچھ گنوار راستہ چل رہے تھے۔ کسی کے کندھے پر ہل تھا، کوئی بیلوں کو ہانکتا ہوا چلا آتا تھا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی گائے بھینس لیے جاتی تھی۔ ایک لڑکا بہت سی بھیڑوں بکریوں کے پیچھے پیچھے تھا۔ یہ سب آنکھوں کے سامنے آئے اور پھر نظروں سے غائب ہو گئے۔ میں پھر اکیلی کی اکیلی ہی رہ گئی۔ نہیں معلوم کس دھن میں تھی۔ مگر اب اس سڑک پر چلنے لگی۔ اپنے نزدیک اب میں گویا تالاب کی طرف جا رہی ہوں۔ اب اندھیرا ہوتا جاتا ہے۔ سورج ڈوبنے ہی کو ہے۔ اب میرے قدم جلد جلد اٹھ رہے ہیں۔ آگے چل کر ایک فقیر کا تکیہ ملا۔ یہاں کچھ لوگ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ یہاں میں نے تالاب کا راستہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ میں لکھنؤ کی طرف چلی جا رہی ہوں۔ تالاب دہنے کو چھٹ گیا ہے۔ یہاں سڑک چھوڑنا پڑی۔ ایک بیڑ میں سے ہو کے راستہ تھا۔ تھوڑی دور جا کر ایک نالہ ملا۔ نالے کے اس پار تھوڑے فاصلے پر دو تین درخت تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان درختوں کی جڑ سے اک ذرا ہٹ کے کوئی شخص میلی سی دھوتی باندھے، مرزئی پہنے، ایک میلا سا چادرہ کمر سے لپٹا ہوا، کھرپی ہاتھ میں لیے کچھ کھود رہا ہے۔ میری اس شخص کی آنکھیں چار ہوئیں۔ پہلے تو کچھ شبہ سا ہوا، پھر ایک مرتبہ غور سے دیکھا۔ اب قریب یقین تھا کہ وہی ہے۔ چاہتی تھی کہ نظر پھیر لوں مگر نگاہ کم بخت اسی طرف لڑی رہی۔ اب تو بالکل یقین ہو گیا۔ قریب تھا کہ غش کھا کے گر پڑوں اور ضرور ہی گر پڑتی، اتنے میں دور سے اکبر علی خاں کے نوکر سلاز بخش کی آواز کان میں آئی۔ مجھے ڈھونڈنے نکلا تھا۔ مجھے دیکھ کر دلاور خان نے کھرپی ہاتھ سے رکھ دی تھی۔ جس طرح میں اسے دیکھ رہی تھی وہ بھی مجھ کو دیکھ رہا تھا۔ مگر یقیناً چاہے مجھے اس نے نہ پہچانا ہوگا۔ میں نے اس کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔

سلاز بخش کی آواز سن کر وہ نالے کی طرف بھاگا۔ اتنے میں سلاز بخش میرے پاس پہنچ گیا۔ میں مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آواز منہ سے نہیں نکلتی تھی۔ کھکھی بندھی ہوئی تھی۔ سلاز بخش نے میرا حال دیکھ کے کہا۔ ”ہائیں ڈر گئیں؟“ میں نے درخت کی طرف اشارہ کیا۔

سلار بخش اس طرف دیکھنے لگا۔

سلار بخش: وہاں کیا دھرا ہے۔ ایک کھرپی پڑی ہے۔ واہ! اس سے ڈر گئیں۔ آپ سمجھیں کوئی قبر کھود رہا تھا۔

(منہ سے تونہ بولا گیا، میں نے ہاتھ سے نالے کی طرف اشارہ کیا)

سلار بخش: چلم پینے گیا ہوگا تکیے پر۔ اچھا تو چلیے۔ نواب چھٹن صاحب بہت سی مرغابیاں شکار کر کے لائے ہیں۔ آپ کا کہیں پتہ نہیں۔ میاں ادھر ڈھونڈنے گئے ہیں، میں ادھر آیا۔ یہ کہتے آپ مل گئیں۔ نہیں تو آپ کو راستہ نہ ملتا۔ میں نے ہاں نہ کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ آخر سلار بخش بھی چپ ہو رہا۔ تھوڑی دیر میں کھیتوں میں سے ہو کے تالاب پر پہنچ گئے۔

رات کو یہیں رہنے کی ٹھہری۔ جب کھانے دانے سے فراغت ہو گئی، میں نے اکبر علی خاں سے کل واقعہ بیان کیا۔

اکبر علی خاں: تم نے اچھی طرح دیکھا۔ یہ وہی دلاور خاں تھا؟ فیض آباد کا رہنے والا تھا؟ اس کا تو حلیہ جاری ہے۔ افسوس تم نے پہلے سے نہ کہا۔ بدمعاش کو چل کے گرفتار کرتے۔ بڑا نام ہوتا۔ سرکار سے انعام ملتا۔ ایک ہزار کا اشتہار ہے۔ اور یہ کھودتا کیا تھا؟ میں: کیا معلوم، مولا اپنی قبر کھودتا ہوگا۔

اکبر علی خاں: اس کے نام سے تمہارے منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔ اب وہ تمہارا کیا کر سکتا ہے۔

میں: (دل کو ذرا تھام کے) ضرور اس نے غدر کے زمانے میں کچھ وہاں گاڑ دیا ہوگا۔ اسے کھودنے آیا ہوگا۔

اکبر علی خاں: چلو دیکھیں۔

میں: میں تونہ جاؤں گی۔

اکبر علی خاں: میں جاتا ہوں۔ سلار بخش کو لیے جاتا ہوں۔

میں: کہاں جاؤ گے؟ اب وہاں کچھ نہ ہوگا؟ وہ کھود کے لے بھی گیا ہوگا۔

اکبر علی خاں: میں تو ضرور جاؤں گا۔

یہ ذرا زور سے کہا۔ پاس چھٹن صاحب کی چھولداری تھی۔ وہ اور بسم اللہ دونوں جاگ رہے تھے۔

نواب: خاں صاحب! کہاں جائیے گا؟  
اکبر علی خاں: نواب صاحب! ابھی آپ نے آرام نہیں کیا؟  
نواب: جی نہیں۔  
اکبر علی خاں: میں حاضر ہوں؟  
نواب: آئیے۔

اکبر علی خاں اور میں دونوں نواب کی چھولداری میں گئے۔ کل واقعہ بیان کیا۔  
نواب: (مجھ سے) اور تم اس بد معاش کو کیا جانو؟  
میں: (اپنی سرگزشت تو ان سے کیا کہتی) میں جانتی ہوں اور اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں بھی فیض آباد کی رہنے والی ہوں۔  
نواب: اخاہ! آپ بھی فیض آباد کی ہیں؟  
اکبر علی خاں: مگر اس مردود کا کوئی بندوبست کرنا چاہئے۔ ایسے میں یہیں کہیں ہے۔ عجب نہیں گرفتار ہو جائے۔

یہ کہہ کر سلار بخش کو آواز دی، قلم دان منگوایا۔ تھانہ قریب تھا، تھانے دار کو رقعہ لکھا۔ تھوڑی دیر میں تھانے دار صاحب مع دس بارہ سپاہیوں کے آ موجود ہوئے۔ میں نے جو دیکھا ان سے کہہ دیا۔ گاؤں سے پاسی بلوائے گئے۔ پہلے اس موقع پر جا کے ڈھونڈا۔ تھکے پر فقیر سے کسی قدر سراغ ملا۔ ایک سپاہی کو ایک اشرفی شاہی زمانے کی ملی۔ وہ تھانے دار کے پاس لے آیا۔  
تھانے دار: خدا چاہے تو مع مال گرفتار ہو۔

تھانے دار صاحب نے واقعی اچھا بندوبست کیا۔ سپاہیوں نے خوب تگ و دو کی۔ آخر تین بجے رات کو مکا گنج میں گرفتار ہوا۔ صبح ہوتے ہوتے تالاب پر پہنچ گیا۔ تلاشی میں چوبیس اشرفیاں سرآمد ہوئیں۔ میں شناخت کے لیے بلائی گئی۔ میری شناخت کے علاوہ دو سپاہیوں نے پہچانا۔  
دس بجے چالان لکھنور روانہ ہو گیا۔

رسوا: اچھا تو پھر اس کا حشر کیا ہوا۔ اس قصے کو جلدی ختم کیجیے۔  
میں: ہوا کیا۔ کوئی دو مہینے کے بعد معلوم ہوا پھانسی ہو گئی۔ واصل جہنم ہوا۔



## اختتامیہ

نہ پوچھ نامہ اعمال کی دل آویزی

تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا

مرزا رسوا صاحب! جب آپ نے میری سوانح عمری کا مسودہ مجھے نظر ثانی کے لیے دیا تھا مجھے ایسا غصہ آیا کہ جی چاہتا تھا پرزے پرزے کر کے پھینک دوں۔ بار بار خیال آتا کہ زندگی میں کیا کم رو سیاہی ہوئی کہ اس کا افسانہ بعد مرنے کے بھی باقی رہے کہ لوگ اس کو پڑھیں اور مجھ کو لعنت ملامت کریں۔ مگر مزاج کی تساہلی اور آپ کی محنت کے لحاظ نے ہاتھ روک لیا۔

اتفاقاً کل شب کو بارہ بجے کے قریب سوتے سوتے آنکھ کھل گئی۔ میں حسب معمول کمرے میں تنہا تھی۔ ماما میں خدمت گار سب نیچے کے مکان میں سو رہے تھے۔ میرے سر ہانے لیمپ روشن تھا۔ پہلے تو بڑی دیر تک کروٹیں بدلا کی۔ چاہتی تھی سو جاؤں مگر کسی طرح نیند نہ آئی۔ آخر اٹھی پان لگا کر کھایا۔ ماما کو پکارا 'حقہ بھر دایا' پھر پلنگ پر جا لیٹی۔ حقہ پینے لگی۔ جی میں آیا کوئی کتاب دیکھوں۔ بہت سے قصے کہانی کی کتابیں سر ہانے الماری میں رکھی تھیں۔ ایک ایک کو اٹھا کے ورق الٹے پلٹے مگر وہ سب کئی کئی مرتبہ کی دیکھی ہوئی تھیں۔ جی نہ لگا۔ بند کر کے رکھ دیں۔ آخر اسی مسودے پر ہاتھ پڑا۔ خفقان کی شدت تھی۔ سچ مچ میں نے اس کے چاک کرنے کا مصمم قصد کر لیا۔ چاک ہی کیا چاہتی تھی کہ یہ معلوم ہوا جیسے کان میں کوئی کہہ رہا ہے۔ "اچھا امراؤ بالفرض اسے تم نے پھاڑ کے پھینک دیا، جلا دیا تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ تمام عمر کے واقعات جو خدائے عادل و توانا کے حکم سے فرشتوں نے مفصل اور شرح لکھے ہیں انہیں کون مٹا سکتا ہے"

اس غیبی آواز سے میرے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے۔ قریب تھا کہ مسودہ ہاتھ سے گر پڑے مگر پھر میں نے اپنے تئیں سنبھالا۔ چاک کرنے کا خیال تو بالکل دل سے محو ہو گیا۔ جی چاہا جہاں سے اٹھایا تھا وہیں رکھ دوں۔ پھر ایک باریوں ہی بلا قصد پڑھنا شروع کیا۔ پہلا صفحہ جب تمام ہو گیا ورق الٹا۔ دو چار سطریں اور پڑھیں۔ اس وقت مجھے اپنی سرگزشت سے کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ جس قدر پڑھتی جاتی تھی جی چاہتا تھا اور پڑھوں اور قصوں کو پڑھنے میں مجھے ایسا لطف کبھی نہ آیا تھا کیوں کہ ان کے پڑھتے وقت یہ خیال پیش نظر رہتا تھا کہ یہ سب بنائی ہوئی باتیں

ہیں، درحقیقت کوئی اصل نہیں۔ یہی خیال قصے کو بے مزا کر دیتا تھا۔ میری سوانح عمری میں جو امور آپ نے قلم بند کیے ہیں وہ سب مجھ پر گزرے ہیں۔ اس وقت وہ سب گویا میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ ہر واقعہ اصلی حالت میں نظر آتا تھا اور اس سے طرح طرح کے اثر میرے دل و دماغ پر طاری ہوتے تھے جس کا بیان بہت ہی دشوار ہے۔ اگر کوئی مجھے اس حالت میں دیکھتا تو اس کو میری دیوانگی میں کوئی شک نہ رہتا۔ کبھی تو میں بے اختیار ہنس پڑتی تھی۔ کبھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے تھے۔ غرضیکہ عجیب و غریب کیفیت تھی۔ آپ نے فرمایا تھا۔ ”جا بجا بناتی جانا۔“ یہاں اس کا ہوش کسے تھا۔ پڑھتے پڑھتے صبح ہو گئی۔ اب میں اٹھی وضو کیا، نماز پڑھی۔ پھر تھوڑی دیر سو رہی۔ صبح کو کوئی آٹھ بجے آنکھ کھلی۔ ہاتھ منہ دھو کے پڑھنے لگی۔ بارے سر شام تک سارا مسودہ پڑھ چکی۔

تمام قصے میں وہ تقریر آپ کی مجھے بہت ہی دلچسپ معلوم ہوئی جہاں آپ نے نیک بختوں اور خراب عورتوں کا مقابلہ کر کے ان کا فرق بتایا ہے۔ واقعی نیک بخت عورتوں کو جس قدر فخر ہوتا ہے اور ہم ایسی بازاریوں کو ان کے اس فخر پر بہت ہی رشک کرنا چاہئے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال آیا کہ اس باب میں بخت و اتفاق کو بہت کچھ دخل ہے۔ میری خرابی کا سبب وہی دلاور خاں کی شرارت تھی۔ نہ وہ مجھے اٹھالاتا اور نہ اتفاق سے خانم کے ہاتھ فروخت ہوتی نہ میرا یہ لکھا پورا ہوتا۔ جن امور کی برائی میں اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا اور اسی لیے ایک مدت ہوئی کہ میں ان سے بیزار اور تائب ہوں اس زمانے میں ان کی حقیقت مجھے کسی طرح نہیں معلوم ہو سکتی تھی۔ نہ ایسا کوئی قانون مجھے بتایا گیا تھا کہ میں ان سے اجتناب کرتی اور اگر ایسا نہ کرتی تو مجھے سزا دی جاتی۔ میں خانم کو اپنا مالک اور حاکم تصور کرتی تھی ان سے بہت ڈرتی تھی اور حتی الامکان ایسا کوئی کام نہ کرتی تھی جو ان کی مرضی کے خلاف ہو۔ اور اگر کرتی بھی تو بہت چھپا کے تاکہ ان کی مار اور جھڑکیوں سے بچ سکوں۔ اگرچہ خانم نے مجھے زندگی بھر پھول کی چھتری بھی نہیں چھوئی، مگر خوف غالب تھا۔ جن لوگوں میں میں نے پرورش پائی تھی جو ان کا طریقہ تھا وہی میرا بھی تھا۔ میں نے اس زمانے میں کبھی کسی مذہبی عقیدے پر غور نہیں کیا اور میرا خیال ہے کوئی ایسی حالت میں نہ کرتا۔

ارضی و سماوی حادثے جن کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے، مگر جب واقعہ ہوتے ہیں تو دلوں میں ایک خاص قسم کی دہشت سما جاتی ہے۔ مثلاً زور سے بادل کا گرجنا، بجلی کا چمکنا، آندھیوں کا آنا، اولوں کا گرنا یا زلزلے کا آنا، سورج کا گہن یا چاند گہن، قحط سالی، وبا وغیرہ ایسے امور اکثر خدائی

غضب کی علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ لوگوں کے بعض اعمالوں کی وجہ سے وہ دفع دفع ہو گئیں، مگر یہ بھی دیکھا کہ بہت سی آفتیں دعا، تعویذ، ٹوٹے ٹکے کسی بات سے نہ ٹلیں۔ ایسے امور کو لوگ خدا کی مرضی، تقدیر آسمانی کی طرف منسوب کر دیا کرتے ہیں۔ مذہبی احکام مجھ کو مفصل نہ پہنچے تھے اور نہ شب عذاب کا مسئلہ اچھی طرح سمجھایا گیا تھا۔ اس لیے ان باتوں کا اثر میرے دل پر نہ تھا۔ بے شک اس زمانے میں میرا کوئی مذہب نہ تھا۔ صرف جواز لوگوں کو کرتے دیکھتی تھی وہی آپ بھی کرنے لگتی تھی۔ اس وقت میں میرا کوئی مذہب ہی نہ تھا۔ تقدیر پر میں بہت ہی شاکر تھی۔ جو کام میں کاہلی سے نہ کر سکتی تھی یا میری بے وقوفی سے بگڑ جاتا تھا۔ جب میرا کوئی مطلب فوت ہو جاتا تھا کسی اور وجہ سے مجھے ملال پہنچتا تھا تو جاوے جانک کی شکایتیں کیا کرتی تھی۔

ہم بھی ہیں مختار لیکن اس قدر ہے اختیار

جب ہوئے مجبور قسمت کو برا کہنے لگے

ملاوی صاحب، بوا حسینی اور بڑھے بڑھیاں جب اگلے زمانے کی باتیں کرتے تھے تو اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس زمانے سے بہت ہی اچھا تھا۔ اس لیے ان کی طرح میں بھی اس زمانے کی غائبانہ تعریف اور زمانہ موجودہ کی بلا وجہ مذمت کیا کرتی تھی۔ میں کم بخت اس بات کو نہ سمجھی کہ بڑھے بڑھیاں، جوان گلے وقتوں کی تعریف کرتے ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ اپنی اپنی جوانی کے دن سب کو بھلے معلوم ہوتے ہیں، اس لیے دنیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ خود زندہ جہان زندہ۔ خود مردہ جہان مردہ۔ سن رسیدہ لوگوں کے دیکھا دیکھی جوانوں نے بھی انہی کا دطرہ اختیار کر لیا ہے اور چونکہ یہ غلط فہمی ایک بدت سے چلی آتی ہے اس لیے اب عموماً سب کو اس کی عادت سی ہو گئی ہے۔

جوان ہونے کے بعد میں عیش آرام میں پڑ گئی تھی۔ اس زمانے میں گاجا کے مردوں کو رجھانا میرا خاص پیشہ تھا۔ اس میں یہ مقابلہ اور ساتھ والیوں کے جس قدر کامیابی یا ناکامی مجھ کو ہوتی تھی وہی میری خوشی اور رنج کا اندازہ تھا۔ میری صورت بہ نسبت اوروں کے کچھ اچھی نہ تھی، مگر فن موسیقی کی مہارت اور شعر و سخن کی قابلیت کی وجہ سے میں سب سے بڑھی چڑھی رہی۔ اپنی ہم پیشہ عورتوں میں مجھے ایک خاص امتیاز حاصل تھا۔ مگر اس سے کچھ نقصان بھی ہوا۔ وہ یہ کہ جس قدر میری عزت زیادہ ہوتی گئی اتنا ہی خود داری کا خیال دل میں پیدا ہوتا گیا۔ جہاں اور رنڈیاں بے باکی سے اپنا مطلب نکال لیتی تھیں، میں منہ دیکھتی رہ جاتی تھی۔ مثلاً ان کا یہ عام قاعدہ تھا کہ ہر کس و ناکس سے کسی نہ کسی قسم کی فرمائش ضرور کر دینی چاہیے۔ مجھے اس سے شرم آتی تھی۔ یہ خیال آتا تھا



کہ ایسا نہ ہوا نکار کر دے تو خفت ہوگی۔ اور نہ ہر شخص میں بہت جلد بے تکلف ہو جاتی تھی۔ میری اور ساتھ والیوں کے پاس جب کوئی آ کے بیٹھتا تو ان سب کو زیادہ فکر اس کی ہوتی کہ یہ کہاں تک دے سکتا ہے اور ہم کہاں تک اس سے لے سکتے ہیں۔ میرا بہت سا وقت اس شخص کی ذاتی لیاقت، حسن اخلاق کے اندازہ کرنے میں صرف ہو جاتا تھا۔ مانگنے کی عادت کو میں معیوب سمجھنے لگی تھی۔ اس کے علاوہ اور باتیں بھی مجھ میں رنڈی پنے کی نہ تھیں۔ اس لیے میرے ساتھ والیوں میں سے کوئی مجھے ناک چوٹی گرفتار، کوئی خفقتانی، کوئی بے وقوف، کوئی دیوانی سمجھتی تھی۔ مگر میں نے اپنی کسی کی نہ سنی۔

پھر وہ زمانہ یاد آیا کہ میں رنڈی کے ذلیل پیٹھے کو عیب سمجھنے لگی اور اس سے دست بردار ہو گئی۔ ہر کس و نا کس سے ملنا چھوڑ دیا۔ صرف ناچ بھرے پر بسراوقات رہ گئی۔ یا کسی رئیس نے نوکر رکھا تو نوکری کر لی، رفتہ رفتہ یہ بھی ترک کر دیا۔

جب ان افعال سے تائب ہوئی جن کو میں نے اپنے نزدیک برا سمجھ لیا تھا تو اکثر میرے جی میں آیا کہ کسی مرد آدمی کے گھر بڑ جاؤں۔ لیکن پھر یہ خیال آیا کہ لوگ کہیں گے ”آخر رنڈی تھی نا“ کفن کا چونگا کیا۔“ مرزا صاحب! شاید اس محاورے کو آپ نہ سمجھیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جب کوئی رنڈی سن سے اتر کر کسی کے گھر بیٹھ جاتی ہے تو تجربہ کار تماش بین اس کی نسبت کہا کرتے ہیں کہ اس رنڈی نے ”کفن کا چونگا کیا“ یا ”مرتے مرتے کفن لے مری۔“ یعنی اپنے دام بچا لیے اور ازراہ فریب تماش بین پر اپنی تجسیم و تکفین کا بار ڈالا۔ اس مثل سے رنڈیوں کی بے حد خود غرضی اور لالچ اور فریب کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ میں سچ بچ تائب ہو گئی اور اب انتہا کی نیک ہوں، مگر اس کو سوائے خدا کے اور کون جانتا ہے۔ کسی کسی شخص کو میری نیکی کا یقین نہیں ہو سکتا۔ پھر اگر اس حالت میں کسی کی محبت کروں اور اس محبت کی بنا پر سراسر خلوص اور نیک نیتی پر ہو، اس پر بھی خاص وہ شخص اور اس کے سوا جو لوگ دیکھیں یا سنیں گے، کبھی یقین نہ لائیں گے۔ پھر میرا محبت کرنا ہی بے سود ہوگا۔ لوگ مشہور کرتے ہیں کہ میرے پاس دولت ہے، اس لیے لوگ اس سن میں بھی میری خواہش کرتے ہیں۔ اور طرح طرح کے فریب مجھ کو دینا چاہتے ہیں۔ کوئی صاحب میرے حسن و جمال کی تعریف کرتے ہیں اگرچہ ان کا تعلق میں ایسی رنڈیوں سے سن چکی ہوں جو بہ درجہ مجھ سے بہتر ہیں۔ کوئی صاحب میرے کمال موسیقی پر غش ہیں، حالانکہ ان کے کان تال سم نے آشنا نہیں۔ کوئی میری شاعری کے مداح ہیں، جنہوں نے عمر بھر ایک مصرع موزوں کہنا تو کیسا پڑھا بھی نہ ہوگا۔ ایک صاحب میری علمیت کے



قائل ہیں۔ خود بھی پڑے لکھے ہیں، مگر مجھ کو ”مولانا بافضل اولانا“ سمجھتے ہیں۔ معمولی مسئلے روزہ نماز کے بھی مجھ ہی سے پوچھ لیا کرتا ہیں۔ گویا کہ آپ میرے مرید یا مقلد ہیں۔ ایک میرے عاشق زار میری دولت اور کمال سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے، صرف میری تندرستی کے خواہاں ہیں۔ ہر بات پر اللہ آمین، مجھے چھینک آئی اور ان کے سر میں درد ہونے لگا۔ مجھے درد سر ہوا اور ان کے دشمنوں کا دم نکلنے لگا۔ ایک بزرگ ناصح مشفق بنے ہیں۔ دنیا کے نشیب و فراز سمجھایا کرتے ہیں۔ مجھ کو بہت ہی بھولا سمجھتے ہیں۔ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں جیسے کوئی دس گیارہ برس کی لڑکی سے باتیں کرتا ہو۔

میں ایک گھاگ عورت ہوں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے ہوئے۔ جو جس طرح بناتا ہے بن جاتی ہوں اور درحقیقت ان کو بناتی ہوں۔ خلوص کے ساتھ بھی ملنے والے دو ایک صاحب ہیں۔ بے غرض ملتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف ایک مذاق خاص ہے۔ مثلاً شعر و سخن یا گانا بجانا یا صرف لطف گفتگو۔ نہ ان کو کوئی غرض مجھ سے ہے نہ مجھے کوئی غرض ان سے ہے۔ ایسے لوگوں کو دل سے چاہتی ہوں اور یہ بے غرضی رفتہ رفتہ ایک غرض ہو گئی ہے کہ نہ مجھے بغیر ان کے چین آتا ہے اور نہ انہیں بغیر میرے۔ مگر ان لوگوں میں سے کوئی میرے گھر میں بٹھانے کا امیدوار نہیں ہے۔ کاش کہ ایسا ہوتا۔ مگر یہ تمنا ایسی ہی ہے جیسے کوئی کہے کاش کہ جوانی پھر آتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کی زندگی جوانی تک ہے۔ اگر جوانی کے ساتھ ہی زندگی ختم ہو جایا کرتی تو کیا خوب ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ یوں تو بڑھاپا ہر ایک کے لیے برا ہے، خصوصاً عورت کے لیے، مگر رنڈی کے لیے بڑھاپا دوزخ کا نمونہ ہے۔ بڑھیا فقیریاں جو لکھنؤ کے گلی کو چوں میں پڑی پھرتی ہیں۔ اگر غور کیجیے گا تو ان میں اکثر رنڈیاں نکلیں گی، اور رنڈیاں بھی کون سی جو کبھی زمین پر پیر نہ رکھتی تھیں۔ قیامت برپا کر رکھی تھی۔ ہزاروں بھرے پرے گھر تباہ کر دیئے، سینکڑوں جوانوں کو بے گناہ قتل کیا۔ جہاں جاتی تھیں لوگ آنکھیں بچھاتے تھے۔ اب کوئی ان کو آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔ پہلے جہاں بیٹھ جاتی تھیں لوگ باغ باغ ہو جاتے تھے۔ اب کوئی کھڑے ہونے کا روادار بھی نہیں۔ پہلے بن مانگے موتی ملتے تھے اب مانگے بھیک نہیں ملتی۔

ان میں اکثر اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا باعث ہوئیں۔ ایک بڑی بی میرے مکان پر کبھی کبھی آیا کرتی تھیں۔ کسی زمانے میں بڑی مشہور رنڈیوں میں تھیں۔ جوانی میں ہزاروں روپے کمائے۔ ذرا مزے دار جیوڑا تھا۔ جب سن سے اتریں، وہی کمائی یاروں کو کھلانا شروع کی۔ بڑھاپے میں ایک نو جوان کے گھر بیٹھیں۔ اس کی جو روخو بصورت، کم سن، بھلا وہ ان پر کیوں رہ جھکتا۔ پہلے تو

بیوی ذرا بگڑیں، مگر جب میاں نے اصل مطلب سمجھا دیا، خاموش ہو رہیں۔ ان کی خاطر میں ہونے لگیں۔ جب تک مال رہا خوب میاں بیوی دونوں نے پھسلا پھسلا کے کھایا آخر کھکھ ہو گئیں۔ اب کون پوچھتا تھا۔ نکال باہر کیا۔ گلیوں کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔

بعض بے وقوف رنڈیوں نے کسی لڑکی کو لے کے پالا۔ اس سے دل لگایا۔ اس حماقت میں میں بھی گرفتار ہو چکی ہوں۔ مگر جب وہ جوان ہوئی، لے دے کے کسی کے ساتھ نکل گئی۔ یا اگر رہی تو کل مال رفتہ رفتہ اپنے قبضے میں کیا۔ ان کو گھر کا انتظام یا ماما گیری کرنے کو رکھ لیا۔

آبادی نے بھی مجھے جل دیا ہوتا، مگر وہ تو کہو اس کے کروت پہلے ہی کھل گئے، نہیں تو مجھے لوٹ ہی لے جاتی۔ مرد کیا اور عورت کیا، رنڈی کی قوم میں بدکاروں کی زندگی کا اصول ہی ایسا بگڑا بنا ہوا ہے کہ ایک دوسرے سے محبت نہیں ہو سکتی۔ نہ کوئی سمجھدار مرد ہی ان کو دل دے سکتا ہے، کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ رنڈی کسی کی نہیں ہوتی اور نہ ہی عورت ایسی محبت کر سکتی ہے۔ نوچیاں اپنے دل میں یہ سمجھتی ہیں کہ کماتے ہم ہیں، پھر ان کو کیوں دیں۔

اگلے قدر دان مرد زوال حسن کے بعد کنار کرتے ہیں۔ یہ اس کی عادی ہوتی ہیں کہ لوگ جھوٹی خوشامد کریں۔ بھلا اب کوئی خوشامد کیوں کرنے لگا۔ غرض کہ مردان سے کنارہ کش اور یہ مردوں کی شاکی رہتی ہیں۔

پہلے پہلے میں بھی اور رنڈیوں کی زبانی مردوں کی بے وفائی کا دکھ اس کے وقت ضائع کرتی تھی اور بے سمجھے ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتی تھی، مگر باوجود اس کے کہ گوہر مرزا نے میرے ساتھ جو سلوک کیا وہ سب آپ کو معلوم ہے، اور نواب صاحب جنہوں نے مجھ پر نکاح کا الزام لگایا تھا، اس کو بھی آپ سن چکے، پھر بھی میں مردوں کو بے وفا نہیں کہہ سکتی۔ اس معاملے میں عورتیں، خصوصاً بازار والیاں ان سے کسی طرح کم نہیں۔ محبت کے باب میں مرد (معاف کیجیے) اکثر بے وقوف اور عورتیں بہت ہی چالاک ہوتی ہیں۔ اکثر مرد سچے دل سے اظہار عشق کرتے ہیں اور اکثر عورتیں جھوٹی محبت جتاتی ہیں۔ اس لیے کہ مرد جس حالت میں اظہار عشق کرتے ہیں وہ حالت ان کی اضطراری ہوتی ہے، اور عورتیں بہت جلد متاثر نہیں ہوتیں، کیوں کہ مرد بہت ہی جلد عورتوں کے حسن ظاہری پر فریقتہ ہو کر ان پر شیدا ہو جاتا ہے اور عورتیں اس باب میں زیادہ احتیاط کرتی ہیں۔ اسی لیے مردوں کی محبت کسی قدر سریع الزوال اور عورتوں کی محبت عسیر الزوال ہوتی ہے۔ مگر جانہین کے حسن معاشرت سے ان امور میں ایک خاص قسم کا اعتدال پیدا ہو سکتا ہے، بشرطیکہ دونوں، یا کم از کم ایک، کو سمجھ ہو۔ واقعی مرد اس باب میں سریع الاعتقاد ہوتے ہیں اور عورتیں انتہا کی شکی۔ مرد پر

عورت کا جادو بہت جلد چل جاتا ہے مگر عورت پر حب کا عمل مشکل سے کارگر ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہ نقص فطرت کی طرف سے ہے اس لیے کہ عورتیں ضعیف القویٰ ہیں اس لیے ان کو بعض وصف ایسے دیئے گئے ہیں جن سے یہ کمی پوری ہو جائے۔ من جملہ ان اوصاف کے ایک وصف یہ بھی ہے بلکہ میں کہہ سکتی ہوں شاید یہی ایک وصف ہے اس کی مثال جانوروں میں بھی مل سکتی ہے۔ اکثر ضعیف جانوروں میں بھی حیلہ گری کا مادہ ہے۔

اکثر مرد یہ کہیں گے کہ عورتیں حسین ہوتی ہیں۔ میں اس کی قائل نہیں۔ درحقیقت نہ مرد ہی بجائے خود حسین ہے نہ عورت بلکہ ہر ایک کو ایسا حسن عنایت ہوا ہے جو دوسرے کو اچھا معلوم ہو۔ یوں تو مرد عورت جس کا ناک نقشہ اچھا ہوتا ہے سب اسے پسند کرتے ہیں مگر اصل قدر دان مرد کے حسن کی عورت اور عورت کے حسن کا مرد ہے۔ ایک خوبصورت عورت دوسری عورت کے سامنے اس خوش رنگ پھول سے زیادہ نہیں ہے جس میں خوشبو نہ ہو ایک بد صورت مرد بھی خوبصورت سے خوبصورت عورت کی رائے میں خوشبودار پھول کی طرح دل پسند ہے اگرچہ اس کی شکل اور رنگت میں کوئی ندرت نہ ہو۔ محبت کے باب میں غلطی صرف ایک ہی طرف سے نہیں ہوتی بلکہ دونوں اس بار کی کو نہیں سمجھتے۔ ان دونوں محبتوں کی اصلیت میں فرق ہے۔ جس نگاہ سے مرد عورتوں کو دیکھتے ہیں اس نگاہ سے عورت مرد کو دیکھتی ہی نہیں۔ عورتوں کی محبت کرنے کا اندازہ اس مرد میں ایک حد تک پایا جاتا ہے جو کسی مالدار عورت کے دامن دولت سے وابستہ ہے یا جس کا سن بہت کم ہے۔ مگر کوئی سن رسیدہ عورت ان کو کیوں چاہنے لگی؟

اس میں شک نہیں کہ عورتیں جوان مرد سے بہ نسبت بڑھوں کے زیادہ محبت رکھتی ہیں مگر اس کی وجہ بھی محض حسن و جمال نہیں ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ عورت ضعیف القویٰ ہے اس لیے وہ ہر حالت میں اپنے حمایتی کو بہت دوست رکھتی ہے تاکہ وقت ضرورت اس کو خطرے سے بچا سکے۔ پس جوان سے بہ نسبت بڑھے کے اس کی زیادہ توقع ہو سکتی ہے اور حسن و جمال اس خوبی کے ساتھ مل کر اس کے وصف کو رونق دے دیتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مرد کی محبت میں صرف لذت حاصل کرنا مقصود ہے اور عورت کی محبت میں الم سے محفوظ رہنا اور لذت حاصل کرنا دونوں غرضیں شامل ہیں۔

چونکہ یہ مشہور ہے کہ محبت بے غرض ہونا چاہئے اور عورت کی محبت میں اس کا زیادہ لگاؤ ہے لہذا وہ اس کے چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ جو امور میں نے اس موقع پر بیان کیے ہیں اس میں اکثر باتوں کا امتیاز نہ مردوں کو ہوتا ہے نہ عورتوں کو تو میں اسے تسلیم کر لوں گی اور



یہ کہوں گی کہ یہ باتیں اصل فطرت سے مرد عورت کے خیر میں داخل ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ انہیں اس کا شعور بھی ہو۔ میں نے عمر بھر کے تجربے کے بعد یہ امور دریافت کئے ہیں اور میرے ساتھ جو شخص اس پر غور کرے گا وہ اسے سمجھ سکتا ہے۔

میں دیکھتی ہوں کہ اکثر عورتیں اور ناخواندہ مرد بھی ایسی باتوں پر غور نہیں کرتے، اس لیے ان کو اپنے زمانہ زندگی میں بہت سی بک بک جھک جھک کرنا پڑتی ہے۔ میرے خیال میں مرد عورت دونوں اپنے اپنے رتبے اور اغراض کو سمجھ لیں تو ان میں ہرگز ملال نہ ہو۔ بہت سی آفتیں ٹل جائیں اور بہت سی دقتیں دور ہو جائیں۔ مگر ایک مشکل ہے کہ جب کسی کی فہمائش کی جائے تو اکثر یہی جواب ملتا ہے۔ ”اوہ جی! جو تقدیر میں ہوگا ہو کے رہے گا۔“ اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم جو چاہیں کریں ہمیں نہ روکو۔ ہمارے لیے کچھ نہیں ہوتا، یعنی ہماری بدکاریوں کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ جو کچھ ہوگا تقدیر سے ہوگا۔ یعنی جو نتیجہ نکلے گا وہ معاذ اللہ خدا کی طرف سے ہوگا۔ یہ لگو گفتگو اگلے زمانے میں کسی قدر بامعنی بھی تھی، کیوں کہ اس زمانے میں اتفاق سے گھڑی بھر میں کچھ کا کچھ ہو جایا کرتا تھا۔ اس پر مجھے شاہی زمانے کی ایک نقل یاد آئی ہے۔

زمانہ شاہی میں انقلاب کا ثبوت اکثر ملتا رہتا تھا۔ لوگوں کی حالتوں میں دفعتاً تغیر ہو جایا کرتا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے۔ ایک سپاہی نہایت ہی شکستہ حال موتی محل کے پھانک کے پاس چبوترے پر پڑا سو رہا تھا۔ قضائے کار نماز صبح کے بعد بادشاہ ٹہلتے ہوئے ادھر آ نکلے۔ اتفاقاً اس وقت کوئی ساتھ نہ تھا۔ معلوم نہیں کیا جی میں آیا، آپ نے اسے جگا دیا۔ وہ سپاہی یوں ہی نیند سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ جہاں پناہ پر نگاہ پڑی۔ پہلے تو گھبرا گیا، پھر ایک ہی مرتبہ سنبھل کے اپنی حالت کو دیکھا۔ فوراً تلوار نذر کی۔ بادشاہ نے نذر قبول کی۔ زنگ آلودہ تلوار تھی۔ میان سے بہ دقت نکلی۔ پھر دیکھ بھال کر اس تلوار کی تعریف کی اور میان میں کر کے اپنی کمر میں لگائی خود جو دلائی باندھے ہوئے تھے جس کا طلائی قبضہ تھا، منہ کمر بند مرصع اس کے حوالے کی۔ اس موقع پر حضور عالم (خطاب علی نقی خاں وزیر اودھ) آ گئے۔ جہاں پناہ نے اس جوان اور اس کی تلوار کی تعریف کی۔

بادشاہ: دیکھنا بھی کیا سجیلا جوان ہے اور تلوار بھی اس کے پاس کیا ہی عمدہ تھی۔ (کمر سے نکال کر) یہ دیکھو۔

وزیر: قبلہ عالم! سبحان اللہ! مگر حضور سا جو ہر شناس اور قدر دان بھی تو ہو جب ایسے لوگ اور ایسی چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔



بادشاہ: مگر دیکھنا بھی میری تلوار کچھ ایسی بدزیب نہیں ہے۔

وزیر: ظل سجانی کی تو اور بدزیب!

بادشاہ: مگر لباس اس کے مناسب نہیں۔

اس اثنا میں اور مصاحب ملازم شاہی چوہدار خاص بردار آ گئے۔ اچھا خاصہ مجمع ہو گیا۔

وزیر: درست ارشاد ہوا۔

بادشاہ: اچھا ہمارے کپڑے تو اسے پہنا کر دیکھے جائیں۔

اس اشارے کے پاتے ہی لوگ دوڑے۔ لباس کی کشتیاں ہاتھوں ہاتھ آ گئیں۔ بادشاہ

نے ملبوس خاص جو اس وقت پہنے ہوئے تھے مع مالائے مردارید اور جوڑی نورتن مرصع کار اسے

عنایت کی۔ آپ اور کپڑے زیب تن کیے۔ جب وہ کپڑے پہن چکا۔

بادشاہ: ہاں اب دیکھو۔

وزیر: واقعی صورت ہی اور ہو گئی۔

مصاحبین اور حضار بھی تعریفیں کرنے لگے۔ بادشاہ تھوڑی دیر یہاں ٹھہرے۔ اب سواری

آگئی تھی۔ سوار ہو کے ہوا کھانے چلے گئے۔ سپاہی خوش خوش گھرا آیا۔ جوہری مہاجن دلال گویا

ساتھ ہی لگے ہوئے تھے۔ اسباب آنکا گیا۔ سب پچاس ساٹھ ہزار روپے کی مالیت تھی۔ سپاہی کا

حال سنئے۔ کہیں نجیبوں کی پلٹن میں تین روپے کا اسم تھا۔ رات کو گھر میں کھانے پر بیوی سے تکرار

ہوئی۔ آپ خفا ہو کے گھر سے نکل گئے۔ رات بھر خدا جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرے۔

صبح ہوتے موتی محل کے پاس تھک کے بیٹھ گئے۔ نیند آگئی۔ صبح کو طالع بیدار نے جگایا تو یہ کرشمہ

نظر آیا دم بھر میں محتاج سے غنی کر دیا۔

اس طرح کے واقعے شاہی میں اکثر ہوا کرتے تھے۔ اور ایسے ہی زمانے میں ان کا ہونا ممکن

ہے۔ جب کہ عنان حکومت ایک شخص کے ہاتھ میں ہو اور وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہ ہو۔

ملک کو اپنی ملک اور خزانے کو اپنے خزانے کا اپنا مال سمجھے۔

انگریزی عمل داری میں ان فضول خرچیوں کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کی بے انصافی

سمجھی جاتی ہے کہ کسی شخص کو بلاوجہ بلا استحقاق ایک رقم کثیر دے دی جائے۔ ایسی سلطنت جس میں

بادشاہ سے لے کر فقیر اک ایک قانون کے پابند ہیں اگر استحقاق کا لحاظ نہ رکھا جائے تو ہرگز کام نہ

چلے۔ اس زمانے میں تقدیر کا زور نہیں چلتا۔ جو کچھ ہوتا ہے تدبیر سے ہوتا ہے۔

نواب چٹٹن صاحب کا حال سنئے۔ (اثناے سوانح عمری میں ان کا بقیہ ذکر فروگزاشت ہو گیا)

تھا) درحقیقت آپ دریا میں ڈوبنے گئے تھے۔ اس ارادے سے غوطہ لگایا کہ اب نہ ابھریں گے۔ مگر جان بہت پیاری چیز ہوتی ہے۔ جب دیر تک پانی کے نیچے رہے دم گھبرانے لگا۔ جی میں آیا اب کی ابھر کر پھر سانس لے لیں۔ ابھرے۔ پانی کی سطح پر آ کر بلا مقصد ہاتھ پاؤں چلنے لگے۔ پھر مرنے کو جی چاہا، پھر غوطہ مارا۔ پھر وہی حال ہوا۔ اسی طرح کئی غوطے لگائے مگر ڈوبتے نہ بن پڑا۔ آخر اسی کوشش میں بہتے بہاتے چھتر منزل تک پہنچ گئے۔ اتفاقاً اس وقت مرزا ولی عہد بہادر (مرحوم) مع اپنے چند مصاحبوں کے بحرے پر سوار ہو کر سیر کو نکلے تھے۔ ان کی نظر جو پڑی سمجھے کوئی شخص ڈوب رہا ہے۔ ملاحوں کو حکم دیا، جلدی نکالو۔ انہوں نے اپنے چھترانے کی بہت کوشش کی۔ وہ لوگ سمجھتے تھے گھبرا گئے ہیں۔ آخر زبردستی کنارے پر لائے۔ مرزا ولی عہد نے اپنے سامنے طلب کیا۔ احوال پرسی کے بعد معلوم ہوا رئیس زادے ہیں۔ کپڑے مرحمت کیے۔ ہمراہ کوٹھی میں لیے چلے گئے۔

چھٹن صاحب ایک تو خوش رو جوان، دوسرے ادب قاعدے سے واقف، علم مجلس سے آگاہ، کسی قدر خواندہ بھی تھے، طبیعت میں مذاق بھی تھا۔ غرض کہ ہر طرح شہزادے کی صحبت کے لائق تھے۔ فوراً مصاحبوں میں اسم ہو گیا۔ بیش قرار مشاہرہ مقرر ہوا۔ اخراجات ضروری کے لیے کچھ مد پیشگی میں مل گیا۔ نوکر چاکر، سواری سب سرکار سے مرحمت ہوا۔ لیجیے پھر کیا تھا، پہلے سے زیادہ ٹھاٹھ ہو گئے۔ اب جو چوک میں نکلے تو جلوس ہی اور تھا۔ ہاتھی پر سوار ہیں۔ پچاس خاص بردار آگے دوڑتے چلے جاتے ہیں۔ بسم اللہ نے اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پہلے تو یقین نہ آیا۔ کہیں میاں مخدوم بخش بھی پیچھے پیچھے چلے آتے تھے۔ ان کو اشارے سے بلایا۔ مفصل حال معلوم ہوا۔ اس کے بعد چچا نے بھی میل کر لیا۔ شادی بھی ہو گئی۔ شادی میں ہم لوگ بھی بلائے گئے تھے۔ خانم کو بہت عمدہ دوشالہ رومال دیا۔ مگر اس دن سے نہ کبھی ہمارے مکان پر آئے، نہ بسم اللہ سے رسم رکھا۔ خانم اور چال چلی تھیں، بن نہ پڑی، الٹی ہو گئی۔

خلاصہ یہ کہ شاہی میں اس قسم کے کرشمے نظر آ جاتے تھے۔ بھلا انگریزی حکومت میں یہ کہاں۔ وہ دن گئے۔ خلیل خاں فاختہ اڑا چکے۔ سنتے چلے آئے ہیں کہ دولت اندھی ہے، مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی حکمت سے اس کی آنکھیں کھول دی گئی ہیں۔ اب اسے لائق اور نالائق کا خیال ہو گیا ہے۔ شاہی عمل داری میں جاہل ناخواندہ جو الف کے نام لٹھ نہیں جانتے تھے، بڑے بڑے عہدوں پر گورنر تھے۔ میں کہتی ہوں ان سے کام کیوں کر چلتا ہوگا۔ اور تو اور موئے خوبہ سراؤں کے پاس پلٹنیں اور رسالے تھے۔ بھلا انصاف کیجیے ہنسنے کی بات ہے یا نہیں۔

۲۲۳ — امر او جان ادا

غرضیکہ تقدیر کی سلطنت کا دور دورہ گیا اور تدبیر کا عہد حکومت آیا۔ اب جو ہر ذاتی پوچھا جاتا ہے اور جو ہر ذات کی دلالہ شہرت سے۔ آپ لکھے پڑھے لائق فائق ہوں، مگر جب آپ کو کوئی جانتا ہی نہیں تو قدر کس کی ہو۔ تقدیر اور تدبیر کے مسئلے میں بہت دن چکر میں رہی۔ آخر معلوم ہوا کہ جن معنوں میں لوگ اس لفظ کو استعمال کر رہے ہیں وہ بالکل دھوکا ہے۔ اگر اس سے یہ مراد ہے کہ خدا کو ہماری سب باتوں کا علم ازل سے ہے تو اس میں کچھ شک نہیں۔ وہ کافر ہے جس کو اس کا اعتقاد نہ ہو۔ مگر لوگ تو معاذ اللہ اپنے تمام افعال ناشائستہ کے برے نتائج کو تقدیر کی طرف نسبت دیا کرتے ہیں۔ اس سے خدا کی قدرت پر الزام آتا ہے یہ بالکل کفر ہے۔

انسوس جن باتوں کو میں اب سمجھی اگر پہلے ہی سے سمجھ گئی ہوتی تو بہت اچھا ہوتا۔ مگر نہ کوئی سمجھانے والا تھا نہ خود اتنا تجربہ تھا کہ آپ ہی آپ سمجھ لیتی۔ مولوی صاحب نے جو دو حرف پڑھا دیئے تھے وہ میرے بہت کام آئے (خدا ان کے درجات عالی کرے۔) اس زمانے میں مجھے اس کی قدر نہ تھی۔ تن آسانی اور آرام طلبی کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ علاوہ اس کے قدر دان اس قدر تھے کہ کسی وقت فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ جب دہ دن آئے کہ قدر دان ایک ایک کر کے کھسنے لگے تو ذرا مجھے مہلت ملی۔ اس زمانے میں کتب بینی کا شوق بڑھا، کیونکہ سوائے اس کے اب کوئی اور شغل نہ رہا تھا۔ میں سچ کہتی ہوں کہ اگر یہ شوق نہ ہوتا تو اب تک میں زندہ نہ رہتی۔ جوانی کے ماتم اور اگلے قدر دانوں کے غم میں کب کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ کچھ دنوں تو میں قصے کہانی کی کتابوں سے دل بہلاتی رہی۔ ایک دن پرانی کتابیں دھوپ دینے کے لیے نکالیں۔ ان میں وہ ”گلستان“ بھی نکلی جو مولوی صاحب سے پڑھی تھی۔ ادھر ادھر ورق الٹ پلٹ کے پڑھنے لگی۔ پہلے مجھے اس کتاب سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ ایک تو اس لیے کہ تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا۔ عبارت مشکل معلوم ہوتی تھی۔ دوسرے تجربہ نہ تھا۔ اس لیے کچھ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اب جو پڑھا تو وہ دقتیں دور ہو چکی تھیں۔ خوب ہی دل لگا کے میں نے سرے سے آخر تک کئی مرتبہ پڑھا۔ فقرہ فقرہ دل میں اترا جاتا تھا۔ اس کے بعد ایک صاحب سے ”اخلاق ناصری“ کی تعریف سن کے اس کے پڑھنے کا شوق ہوا۔ انہی سے ایک نسخہ منگا کے پڑھا۔ واقعی اس کتاب کے مطلب بھی مشکل ہیں اور عربی لفظیں کثرت سے ہیں۔ اس لیے اس کے سمجھنے میں بہت دقت ہوئی۔ مگر تھوڑا تھوڑا پڑھ کے بہت دنوں میں کتاب کو ختم کیا۔

پھر ”دانش نامہ غیاث منصور“ نول کشور کے مطبع میں چھپا اسے پڑھا۔ پھر ایک مرتبہ صغریٰ و کبریٰ کو بجائے خود مطالعہ کیا اور جو جو سمجھ میں نہیں آتا اس سے ترجمہ لیا۔ اب کتابوں کو پڑھنے سے



مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے دنیا کے بھید مجھ پر کھلتے جاتے ہیں۔ ہر بات کی سمجھ آ گئی۔ اس کے بعد میں نے بہت سی کتابیں اس قسم کی اردو فارسی کی بجائے خود پڑھیں۔ اس سے طبیعت کو جلا ہوتی گئی۔ قصائد انوری و خاقانی جتہ جتہ پڑھے۔ مگر جھوٹی خوشامد کی باتوں میں اب میرا دل نہ لگتا تھا۔ اس لیے ان کو بند کر کے الماری میں رکھ دیا۔ فی الحال کئی اخبار بھی میرے پاس آتے ہیں۔ انہیں دیکھا کرتی ہوں۔ ان سے دنیا بھر کا حال معلوم ہوتا رہتا ہے۔ کفایت شعاری کی وجہ سے میرے پاس اب بھی اس قدر اندوختہ ہے کہ اپنی زندگی بسر کر لے جاؤں گی۔ وہاں کا مالک اللہ ہے۔ میں بہت دن ہوئے سچے دل سے توبہ کر چکی ہوں اور حتی الوسع نماز روزے کی پابند ہوں۔ رہتی رنڈی کی طرح ہوں۔ خدا چاہے مارے چاہے جلانے مجھ سے پردے میں گھٹ گھٹ کے تو نہ بیٹھا جائے گا۔ مگر پردہ والیوں کے لیے دل سے دعا گو ہوں۔ خدا ان کا راج سہاگ قائم رکھے اور رہتی دنیا تک ان کا پردہ رہے۔

اس موقع پر میں اپنی ہم پیشہ عورتوں کی طرف مخاطب ہو کے ایک نصیحت کرتی ہوں۔ وہ اپنے دل پر نقش کر لیں۔

اے بے وقوف رنڈی! کبھی اس بھلا دے میں نہ آنا کہ کوئی تجھ کو سچے دل سے چاہے گا۔ تیرا آشنا جو ہر وقت تجھ پر جان دیتا ہے۔ چار دن کے بعد چلتا پھرتا نظر آئے گا۔ وہ تجھ سے ہر گز نباہ نہیں کر سکتا اور نہ تو اس لائق ہے۔ سچی چاہت کا مزا اسی نیک بخت کا حق ہے جو ایک کامنہ دیکھ کے دوسرے کامنہ کبھی نہیں دیکھتی۔ تجھ جیسی بازاری شفتل کو یہ نعمت خدا نہیں دے سکتا۔

خیر میری تو جیسی گزربا تھی، گزر گئی۔ اب میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔ جتنے دن دنیا کی ہوا کھانا ہے کھاتی ہوں۔ میں نے اپنے دل کو بہر طور سمجھا لیا ہے اور میری کل آرزوئیں پوری ہو چکیں۔ اب کسی بات کی تمنا نہیں رہی، اگرچہ یہ آرزو کم بخت وہ بلا ہے کہ مرتے دم تک دل سے نہیں نکلتی۔

مجھے امید ہے کہ میری سوانح عمری سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوگا۔ اب میں اپنی تقریر کو اس شعر پر ختم کرتی ہوں اور سب سے امیدوار دعا ہوں۔

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات  
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی

تمت بالخیر



## ہماری اہم کتابیں

زیتون کی ڈالی	ڈاکٹر عائشہ درانی	۱۵۰ روپے
کلیاتِ اقبالؒ	علامہ محمد اقبالؒ	۱۹۰ روپے
کلیاتِ ساحر	ساحر لدھیانوی	۱۹۰ روپے
کلیاتِ ساغر	ساغر صدیقی	۱۳۰ روپے
جہانِ دانش	احسان دانش	۳۰۰ روپے
جہانِ دگر	احسان دانش	۳۵۰ روپے
صندل	قتیل شفا کی	۱۵۰ روپے
گئے دنوں کا سراغ	منظف وارثی	۱۵۰ روپے
تنہا تنہا گزری ہے	منظف وارثی	۱۵۰ روپے
نیلے پھولوں کی بارش میں	سعد اللہ شاہ	۱۵۰ روپے
کہو وہ چاند کیسا تھا	فاخرہ بتول	۱۲۰ روپے
چاند نے بادل اوڑھ لیا	فاخرہ بتول	۱۲۰ روپے
پلکیں بھیگیں بھیگیں سی	فاخرہ بتول	۱۲۰ روپے

خزینہء علم و ادب

